نگار - ستمبر ۵۵ء

-: READING ROOM :-
-: Hindustani Library :-
R-28, Garden Reach Rd. Cal—24.
No.....Date.....

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱؍

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ چھ آنے (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد طباعتیں غیر زبانوں میں منتقل کی گئیں۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالا
ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن
بیان ندرت خیالات اور پاکیز
زبان کے بہترین شاہکار و
کے علاوہ بہت سے اجتماعی
معاشرتی مسائل کا حل بھی
نظر آئے گا ہر افسانہ ہر مقا
اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت
رکھتا ہے اس اڈیشن میں افسانے
اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنو
میں نہ تھے
قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی۔ بہ سالہ دور تصنیف و تالیف کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر نہایت بلند انشائیاں اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے
قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنہیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ و کرامت (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱)۔ سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) عالم برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ
ضخامت ۲۲۴ صفحات کاغذ سفید و بیسز
قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات (مجلد)

اس کتاب میں نباشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ نباشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

۵۶ء میں دو خاص نمبر

شایع ہوں گے

ایک "**خدا نمبر**" جنوری ۵۶ء میں دوسرا "**اُردو نمبر**" جولائی ۵۶ء میں - ہو سکتا ہے کہ "**اُردو نمبر**" جنوری میں شایع کیا جائے اور "**خدا نمبر**" جولائی میں - اس کا فیصلہ قارئین نگار پر چھوڑا جاتا ہے

"**خدا نمبر**" کے بابت بعض تفصیلات آپ کو معلوم ہو چکی ہیں - "**اُردو نمبر**" کے بعض عنوانات یہ ہوں گے :

اُردو زبان ـــ اُردو دکن اور دہلی میں ـــ اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ ـــ اُردو کے تنزل کے اسباب ـــ اُردو کے ارتقائی منازل ـــ اُردو نثر سو سال میں ـــ اُردو ادب کا سماجی پس منظر ـــ ہندوستانی اور اُردو ـــ اُردو قومی زبان کی حیثیت سے - وغیرہ

منیجر

:: READING ROOM ::
:: Hindustani Library ::
R-28, Garden Reach Rd. Cal-24
No..... Date.....

پاکستان کے خریدارانِ "نگار"

سالانہ چندہ (پیشگی) ذریعہ منی آرڈر فیل کے پتہ پر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس لکھنؤ بھیجدیں - ہماری مطبوعات بھی اسی پتہ پر خط و کتابت کرنے سے مل سکتی ہیں :

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵، سوبھ راج چیتو مل روڈ - ویسٹ گارڈن - کراچی

اگر ۱۵ر تک کسی ماہ کا پرچہ آپ کو نہ ملے

تو اطلاع ملنے پر آیندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ ہم اپنے صرف سے فراہم کر دیں گے لیکن اگر آپ اس سے قبل چاہیں گے تو بیرنگ روانہ ہوگا (کیونکہ مہینے کے اندر اندر پیڈ بھیجنے میں ہم کو وہ گنا محصول ادا کرنا ہوگا) اس لئے جب آپ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دیں تو یہ ضرور لکھ دیجئے کہ آپ فوراً چاہتے ہیں یا اگلے پرچے کے ساتھ -

منیجر نگار لکھنؤ

بعض کمیاب کتابیں

سوانح اُردو

۱۔ آثارِ غالب --- شیخ محمد اکرم --- معہ
۲۔ غالب --- غلام رسول مہر --- معہ
۳۔ یادگار غالب --- حالی --- معہ
۴۔ الغزالی --- شبلی --- ے
۵۔ تذکرہ کاملانِ رامپور --- عہ
۶۔ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی --- صہ
۷۔ مشاہیر عالم طبقۂ حکماء --- صہ
۸۔ الہارون --- مصباح الدین --- ے
۹۔ حیات انیس --- اشہری --- معہ
۱۰۔ واقعات انیس --- احسن --- ے
۱۱۔ قاموس المشاہیر حصّہ اول --- عہ
۱۲۔ البرامکہ --- عبدالرزاق --- عہ
۱۳۔ نور جہاں بیگم --- اشہری --- ے
۱۴۔ سیرۃ النعمان --- شبلی --- ے
۱۵۔ حیات خسرو --- صہ
۱۶۔ رسوا اور مرزا --- ناظر کاکوری --- ے

تذکرۂ اُردو

۱۷۔ گلِ رعنا --- عبدالحی --- ے
۱۸۔ سخن شعراء نساخ --- عہ
۱۹۔ گلشنِ ہند --- ڈاکٹر زور --- معہ
۲۰۔ آبِ بقا --- عشرتی --- للعہ
۲۱۔ بہارِ سخن --- سندر لال --- عہ
۲۲۔ چمنستانِ شعراء --- شفیق --- عہ
۲۳۔ خطبات گارساں دتاسی --- عہ
۲۴۔ سراپا سخن --- محسن علی --- عہ
۲۵۔ تذکرۂ ہندی --- مصحفی --- عہ
۲۶۔ دستور الفصاحت، یکتا --- عہ
۲۷۔ پنجاب میں اُردو شیرانی --- عہ

سفرنامے اُردو

۲۸۔ حکیم ناصر خسرو --- ۸ہ
۳۰۔ سیر و سیاحت --- ڈاکٹر برنیر --- سہ

ادب اُردو

۳۱۔ دیوان میر حسن --- عہ
۳۲۔ خمخانۂ عشق --- امیر مینائی --- معہ
۳۳۔ مراۃ الغیب --- امیر مینائی --- ۸ہ
۳۴۔ کلیات ناسخ --- معہ
۳۵۔ تاج سخن --- جلیل --- ے
۳۶۔ کلیات سودا --- ے
۳۷۔ دیوانِ مجروح --- ۸ہ
۳۸۔ کلیات تسلیم --- صہ
۳۹۔ نشتر --- یاس عظیم آباد --- عہ
۴۰۔ آیات وجدانی --- یگانہ --- ے
۴۱۔ کلیات میر --- سہ
۴۲۔ کلیات مومن --- سہ
۴۳۔ دیوان ولی دکنی --- معہ
۴۴۔ کلیات نظیر
۴۵۔ زندگانی بے نظیر } شہباز --- سہ
۴۶۔ دیوانِ قلق --- ۸ہ
۴۷۔ نقش چغتائی --- سہ
۴۸۔ کلیات نظیر --- ۸ہ
۴۹۔ کلیات تراب --- سہ

تاریخ اُردو

۵۰۔ گنج شایگاں --- تاریخ سکہ جات مغلیہ --- صہ
۵۱۔ احسن التواریخ، تاریخ اودھ --- تمنا --- معہ
۵۲۔ تاریخ الاسلام احسان اللہ --- عہ
۵۳۔ آثار الصنادید، پہلا اڈیشن --- سہ
۵۴۔ تاریخ ڈھاکہ --- طیش --- عہ
۵۵۔ صنادید عجم، مہدی حسین، ادب فارسی کی تاریخ --- سہ
۵۶۔ تاج التواریخ تین جلد مصور، نصرت علی --- ۵ہ
۵۷۔ دربار اکبری --- آزاد --- معہ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ ستمبر میں ختم ہوگیا اور اکتوبر کا "نگار" آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں وی، پی ہوگا جس میں سالنامہ ۵۵ء کی قیمت (مع مصارف رجسٹری) بھی شامل ہے

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۸ | فہرست مضامین ستمبر ۵۵ء | شمار ۳

ملاحظات ---------- اڈیٹر ---------- ۳
نیاز کی مضمون نگاری ---------- محمد خورشید عاصم -- ۵
"پیام کیف" میری نظر میں ---------- رشید حسن خاں --- ۱۳
فارسی ڈرامہ کی بنیاد ---------- رغیب حسین --- ۲۲
فضا کی شاعری اور "وطنیت" --- نور مظفر ---- ۲۶
یادِ رفتگاں ---------- ۳۲
شفا گوالیاری ---------- کوثر چاندپوری --- ۳۴
فنِ تحریر کی تاریخ ---- محمد اسحاق صدیقی ------ ۳۷
عورت اور تعلیم --- اڈیٹر ---------- ۴۱
مشاعرۂ نگار ---------- ۴۶
منظومات: فضا ابنِ فیضی، پروفیسر شور، ساقی جاوید، حامد بھوپالی، راغب مرادآبادی، ساحل بلگرامی، نفیس قادری، حیات لکھنوی، مضطر حیدری ۴۸
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۲

ملاحظات

مشرقِ وسطیٰ اور برطانوی سیاست

ہندوستان کی آزادی کے بعد جب برطانیہ کی استعماری ساکھ ختم ہوئی اور بین الاقوامی سیاست امریکہ و روس میں تقسیم ہوگئی تو برطانیہ نے امریکہ کا دامن پکڑنا مناسب سمجھا، کیونکہ اس کی اقتصادی زبوں حالی اور مدافعانہ کمزوری کو امریکہ ہی دور کرسکتا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اس نے یہ کوشش بھی شروع کی کہ مشرقِ وسطیٰ میں جو اثرات اس کے قایم ہوچکے ہیں وہ زایل نہ ہونے پائیں اور عراق کی پٹرولی دولت اس کے ہاتھ سے نہ جانے پائے اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے مشرقِ وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کی تحریک شروع کی جس میں عراق و ترکی تو پیش پیش ہی شامل ہوگئے اور پاکستان نے بھی اس پر کچھ دنوں بعد اپنی رضامندی ظاہر کردی گو اپنے اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے وہ اس میں اب تک نہ تو شریک ہوسکا ہے اور نہ کوئی ٹھوس حصہ ہی لے رہا ہے۔ حال امریکہ کا ہے کہ وہ بھی اس مسئلہ پر ابھی غور کر رہا ہے۔ کیونکہ سعودی حکومت نے اس تنظیم میں شرکت سے انکار کردیا ہے اور امریکہ کے لئے سعودی حکومت کی خاطرداری وہاں کے پٹرولی چشموں کی وجہ سے اشد ضروری ہے۔

سعودی حکومت کے علاوہ مصر کی شرکت بھی اس تنظیم میں ضروری تھی اور برطانیہ کو توقع تھی کہ وہ بھی بلدیا بدیر اس تنظیم میں شریک ہوجائیگا لیکن اتفاق سے اسی زمانہ میں جنیوا کانفرنس منعقد ہوگئی اور بلگانن کے اس بیان نے کہ "غیر جانبدار بننے والے اور کسی عسکری بلاک میں شامل نہ ہونے والے ممالک کی حفاظت روس کا فرض اولین ہوگا" اور پھر اس کے بعد ہی اس خبر نے کہ جنرل ناصر روس کی دعوت پر ماسکو جارہے ہیں برطانیہ کی وزارت خارجہ کو بہت تشویش میں ڈال دیا، ہرچند کرنل ناصر کی طرف سے یہ خیال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اشتراکی بلاک میں شامل ہوجائیں گے یا مصر میں اشتراکی تحریک کو پسند نہیں کرتے، لیکن بلگانن کے بیان سے فایدہ اٹھاکر غیر جانبداری بلاک میں شامل ہوجانے کے امکانات مصر کے

زیادہ قوی ہو گئے ہیں۔

برطانیہ کی وزارت خارجہ کا خیال ہے کہ ماسکو اور مصر کے درمیان اس ربط کے محرک نہرو ہیں یعنی ایک طرف انھوں نے ماسکو میں بلگانن کو کرنل ناصر کے بلانے کا مشورہ دیا اور جب نہرو، روس سے لوٹتے ہوئے قاہرہ آئے تو دوسری طرف کرنل ناصر کو آمادہ کیا کہ وہ اس دعوت کو قبول کرلیں اور نہرو نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ مارشل ٹیٹو کی طرح 'نیوٹرل بلاک' میں وہ مصر کو بھی شامل کرسکیں، بہرحال اس سے انکار ممکن نہیں کہ اگر سعودی عرب اور مصر دونوں نے غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کرلیا تو مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کا خواب مشکل ہی سے شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

اس سلسلہ میں ایران کے سامنے بھی یہ سوال پیش کیا گیا لیکن اس نے اس پر زیادہ آمادگی ظاہر نہیں کی کیونکہ اُسے روس سے گیارہ ٹن سونا ملنا تھا اور بعض سرحدی مسایل بھی طے کرنا تھے پھر اب کہ روس نے اسے سونا بھی دیدیا ہے اور سرحدی مسایل طے کرنے پر وہ اس حد تک آمادہ ہو گیا ہے کہ اس نے شاہ ایران کو اپنے یہاں آنے کی دعوت بھی دیدی ہے، ایران سے یہ توقع کرنا کہ وہ روس کے خلاف مشرق وسطیٰ کی تنظیم میں شریک ہو جائے گا، صحیح نہیں، کیونکہ اول تو ایران کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ روس و برطانیہ دونوں میں سے کسی کو اخیر وقت تک مایوس نہ ہونے دے اور ادھر یا اُدھر کوئی فیصلہ کبھی نہ کرے، دوسرے یہ کہ ایران کے حدود روس سے اس قدر قریب ہیں کہ وہ اس سے بگاڑ کر کے برطانیہ کی مدد کے بھروسہ پر جو بہت دور واقع ہے، کبھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا۔

الغرض جنیوا کانفرنس کے بعد روس نے دُنیا میں غیر جانبداری اور دوسرے ممالک میں عدم مداخلت کی پالیسی کا اعلان کرکے دُنیا کی گرد آلود فضا کو بڑی حد تک صاف کردیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا یہ وہ ہتھیار ہے جو ایٹم بم سے زیادہ مفید و کارگر ثابت ہوگا اور بہت سے ممالک کو منطقۂ اشتراکیت میں کھینچ لائے گا۔

پاکستان کا دورِ وزارت

آزادی کے بعد پاکستان کی یہ چوتھی وزارت اور چوتھی سیادت عظمیٰ ہے جو حال ہی میں کرنل اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی کی وزارت میں قایم ہوئی ہے، اس سے قبل کی وزارتوں پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کے عہد میں اچھا یا برا جو کچھ وہ سب کو معلوم ہے، البتہ اس نئے دور کے متعلق ضرور قیاس آرائی کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور لوگ قیاس آرائی سے کام بھی لے رہے ہیں۔

ہم ہندوستان میں رہکر پاکستان کے اندرونی معاملات کو نہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان پر چنداں غور کرنے کی ضرورت ہے، لیکن جس حد تک ہندوستان و پاکستان کے باہمی تعلقات کا سوال ہے قدرتاً ہم کو وہاں کے ہر انقلاب پر غور کرنے کو جی چاہتا ہے اور صرف اس توقع پر کہ ممکن ہے اب بھی ہندوستان و پاکستان دونوں دو بھائیوں کی طرح مل جل کر زندگی بسر کرنا سیکھ جائیں اور موجودہ دور تلخ بدمذہبی کسی طرح ختم ہو جائے۔ اس لئے اس خواہش کو سامنے رکھ کر جب ہم پاکستان کی نئی وزارت پر غور کرتے ہیں تو ہم کو ایک گوشہ سے امید کی کرن بھی پھوٹتی نظر آتی ہے، اس لئے نہیں کہ وہاں کے اندرونی اختلافات ختم ہو گئے ہیں، وہاں کی جماعتی و صوبائی عصبیت دور ہو گئی ہے۔ وہاں کی جاگیردارانہ ذہنیت بدل گئی ہے، یا وہاں صحیح معنی میں جمہوریت پیدا ہو گئی ہے بلکہ صرف اس لئے کہ وہاں کے موجودہ وزیر اعظم اور گورنر جنرل دونوں کسی خاص سیاسی جماعت سے گہرا تعلق نہیں رکھتے اور ہو سکتا ہے کہ آیندہ یہی کم "تعلقی" کوئی صحیح راہ تلاش کرسکے۔ چودھری محمد علی، یقیناً سیاسی آدمی نہیں ہیں لیکن کام کے آدمی ضرور ہیں۔ وہ اپنی ذات سے بڑے محنتی، بیحد جفاکش اور خاموشی کے ساتھ ان تھک کام کرنے والے انسان ہیں اور اس وقت پاکستان کے اندرونی اختلافات کو دور کرنے کے لئے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ رہی وہاں کی سیاست خارجہ سو وہ یقیناً اسکندر مرزا کے ہاتھ میں ہوگی اور چونکہ وہ عسکری طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جنگ کتنی بڑی تباہی ہے، اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ وہ پاکستان کی آیندہ ترقی و استقامت کے لئے صلح و آشتی ہی کا راستہ اختیار کریں گے اور اس قسم کی لاف و گزاف کو پسند نہ کریں گے جس سے ان کے پیش رووں کے زمانہ میں بارہا کام لیا گیا ہے اور جس نے ہمیشہ نفع کی جگہ نقصان ہی پہونچایا ہے۔ پاکستان کی کابینہ میں ایک ہندو کا وزیر قانونی بنایا جانا اور روپیہ کی قیمت کو گھٹا کر ہندوستانی سکہ کی سطح پر لے آنا پہلے مبارک اقدامات اس وزارت کے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ چودھری محمد علی آیندہ اس سے زیادہ وسعت نظر سے کام لینے کی کوشش کریں گے۔

READING ROOM
Hindustani Library
R-25, Garden Reach Rd. Calcutta
Date
No.

نیاز کی مضمون نگاری

انگریزی تسلط نے جہاں ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو متاثر کیا وہاں ادب بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خواہ یہ ادب نظم ہو یا نثر۔ بعض چیزیں تو ایسی ہیں جو انگریزی اثرات کی وجہ سے اُردو ادب میں نئی پیدا ہو گئیں اور بعض جو ہمارے پاس موجود تھیں۔ ان میں ان اثرات کی وجہ سے ایک تغیر سا پیدا ہو گیا۔ نئی اصناف مثلاً مختصر افسانہ، ناول، نظم، آزاد شاعری اور مضمون نگاری وغیرہ وہ چیزیں ہیں جو اُردو ادب کے لئے نئی کہی جا سکتی ہیں۔ ہمارے ہاں کی داستانیں تو تھیں لیکن افسانے اور ناول نہ تھے، بڑی مثنویاں اور دیوان موجود تھے۔ لیکن آزاد شاعری سے ہمارے شعرا واقف نہ تھے۔ یہی حال مضامین کا ہے۔ مضمون نگاری تقریباً ناپید تھی۔

اُردو ادب میں مضمون نگاری کی ترویج کا سہرا سرسید کے سر ہے۔ سرسید ۱۸۶۹ء میں جب انگلستان گئے تو وہاں ان کو سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کے پرانے پرچے دیکھنے کا موقعہ ملا اور انھوں نے ان میں شائع شدہ مضامین کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ نے انھیں بہت متاثر کیا انھوں نے دیکھا کہ ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر میں مختلف مجلسی، علمی اور ادبی موضوعات پر چھوٹے چھوٹے مضمون ہیں۔ جن میں اُس دور کے انگلستان کی کئی برائیوں اور کئی نقائص پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بغرض اصلاح تنقید کی گئی ہے۔ مضمون نگاری گو اصلاً فرانس کی پیداوار تھی[1] لیکن اس نے موجودہ صورت فرانس میں اختیار کی اور مونٹنگنے MONTIGNE کو موجودہ صنف مضمون نگاری کا موجد مانا جاتا ہے[2]۔ ۱۶۰۰ء کے ارگرد مونٹنگنے کے مضامین انگلستان میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے اور ان کا ترجمہ انگریزی میں کیا جا رہا تھا۔ مضمون نگاروں میں سب سے پہلا مشہور انگریز بیکن ہے۔ جس نے انگریزی میں اس صنف کی طرح ڈالی۔ خیال ہے کہ بیکن، مونٹنگنے کے مضامین سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ بہر حال انگلستان میں بیکن کی وجہ سے مضمون نگاری کو وسعت اور مقبولیت حاصل ہوئی[3]۔ تاہم اس کی ترقی میں سب سے زیادہ سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کا ہاتھ ہے۔ جو بالترتیب ۱۷۱۱ اور ۱۷۰۹ میں نکلے تھے۔ ۱۷۱۷ کے بعد گارڈین بھی اس زمانہ میں سٹیل نے ایڈیسن کی مدد سے نکالا[4]۔ ان پرچوں میں لکھنے والے اپنے زمانہ کے اور مابعد کے زمانہ کے بہت بڑے ادیب سٹیل پوپ اور ایڈیسن تھے۔ ان پرچوں نے جہاں اس دور کے اہم مجلسی اور علمی مسایل پر روشنی ڈالی تھی اور ان موضوعات پر مضامین پیش کئے تھے۔ وہاں انگریزی نثر کو بھی متاثر کیا تھا[5]۔ بالخصوص سپیکٹیٹر نے طرز تحریر لوگوں کو سکھا دی[6]۔ یہی چیزیں تھیں جو سرسید کو پسند آئیں اور انھوں نے اس انداز پر ایک پرچہ ہندوستان میں بھی جاری کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور اس میں مذہبی اور علمی مضامین شایع کرنے شروع

---

[1] TYPICAL FORM OF ENGLISH LITERATURE ص ۱۱۷
[2] "
[3] "
[4] "
[5] "
[6] تہذیب الاخلاق - جلد دوم - ص ۴۰۴ — [7] تہذیب الاخلاق - جلد دوم - ص ۴۰۸
[8] " " صفحہ ۴۰۹

کئے۔ ظاہر ہے کہ یہ مضامین قوم کی مجلسی، معاشرتی۔ مذہبی اور اخلاقی اصلاح کے مدِ نظر لکھنے شروع کئے گئے اور ساتھ ہی ساتھ اردو زبان میں ایک سادہ اور بے تکلف طرزِ نگارش کی ترویج کو بھی خاص اہمیت دی گئی جس میں مدعا نگاری کا اصول سب سے پہلے نمایاں تھا۔

تہذیب الاخلاق میں لکھنے والے سرسید کے علاوہ بھی کئی اصحاب تھے جن میں سے نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک۔ مولانا حالی۔ نواب اعظم یار جنگ۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی نذیر احمد۔ علامہ شبلی نعمانی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۲ سال کے عرصہ میں جو مضامین وقتاً فوقتاً اس پرچہ میں شایع ہوئے ان کی تعداد ۲۲۶ ہے اور ان میں سرسید کے خود نوشت مضامین ۱۱۲ شمار کئے جاتے ہیں[1] ان مضامین میں زیادہ تعداد مذہبی مضامین کی ہے۔ کیونکہ سرسید اور ان کے رفقا مسلمانوں کی اصلاح چاہتے تھے اور یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان مذہبی توہمات اور تاویلات کی وجہ سے زوال پذیر ہیں۔ اس لئے انھوں نے ان مسایل پر زیادہ توجہ کی۔ اور اس طرح قوم کی جہالت کے قید و بند سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کے پہلے پرچہ میں لکھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ سویلائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو۔ اور وہ بھی دنیا میں مہذب کہلائیں[2]۔ ان مضامین میں جو اخلاقی اور تمدنی نقطۂ نظر کے ماتحت لکھے گئے، چند ایک مضامین یہ ہیں: بحث و تکرار۔ خوشامد۔ رسم و رواج۔ طریقہ تناول طعام۔ خط و کتابت وغیرہ اور اسی طرح مذہبی اور علمی مضامین میں سے چند ایک یہ ہیں:۔ مذہب اور عام تعلیم۔ دین اور دنیا کا رشتہ۔ احادیث غیر معتمد۔ مسئلہ جبر و اختیار۔ عقاید اہلِ اسلام وغیرہ۔

سرسید کے مضامین کو اپنے زمانہ میں خاص شہرت حاصل ہوئی۔ کیونکہ ان میں پرانے رسم و رواج اور عقاید پر خاص چوٹیں کی گئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تہذیب الاخلاق کے خلاف کئی اخبار نکالے گئے، مثلاً:۔ امداد الآفاق۔ مزید الاوہام۔ نور الآفاق۔ نور الانوار وغیرہ ان مخالف اخبارات میں سرسید اور ان کے رفقا کے لکھے ہوئے مضامین کا جواب دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مضمون نگاری کی صنف کو مقبولیت اور وسعت نصیب ہوئی۔ تہذیب الاخلاق کے بند ہونے کے بعد کئی اخبارات میں وقتاً فوقتاً مضمون نکلتے رہے۔ جن میں مولانا عبدالحلیم شرر کا دلگداز، محشر اور مہذب کافی مشہور[3] ہیں۔ ان میں شایع شدہ مضامین کتابی صورت میں جمع ہو کر کئی جلدوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح "اودھ پنچ"[4] میں لکھنے والے سجاد حسین، رتن ناتھ سرشار، احمد علی کسمنڈوی، پنڈت جوالا پرشاد اور مرزا مچھو بیگ ستم ظریف خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ "اودھ پنچ" میں شایع شدہ مضامین کا لہجہ ظریفانہ اور طنزیہ ہوتا تھا۔

سرسید کے رفقا میں سے بعض احباب ابھی بقیدِ حیات ہی تھے کہ نیاز نے بھی مضمون نگاری شروع کی۔ نیاز صاحب کے مضامین کا بھی حصہ اکثر مذہبی مضامین پر مشتمل ہے۔ باقی مضامین میں کچھ علمی ہیں کچھ تنقیدی ہیں کچھ تاریخی اور بعض ایسے ہیں جنھیں مضمون سے زیادہ انشائے لطیف کا نام دیا جائے تو بجا ہوگا۔ مذہبی مضامین میں سے بعض وہ ہیں جو جواب الاستفسار میں مختلف اصحاب کی جانب سے مختلف اوقات میں استفسارات کے جواب میں لکھے گئے۔ اور بعض وہ ہیں جو اپنے نظریات کی وضاحت اور اشاعت کے لئے لکھے۔ چند ایک مضامین یہ ہیں۔ مثلاً:۔ خدا ہے یا نہیں۔ ہمارے علماء کرام کا دینی نظریہ۔ مذہب و الحاد۔ بقائے روح۔ معاد۔ خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا۔ قرآن کے کلام خدا ہونے کا صحیح مفہوم۔ روایت و معجزہ وغیرہ۔

سرسید کی طرح نیاز کے مضامین میں بھی عام طور پر مروجہ مذہبی عقاید کے خلاف ایک بغاوت کا جذبہ پایا جاتا ہے، لیکن سرسید کا حملہ اتنا سخت نہیں تھا جتنا نیاز کا۔ سرسید نے بعض روایات کی تردید کی اور بعض اعتقادات کی عقلی نقطۂ نظر سے تاویل پیش کی۔ خلاف روایات میں سے تعصب اور رسم و رواج کا قلع قمع مقصود تھا اور عقاید میں سے جن، فرشتے، قیامت، معجزات حور و غلمان وغیرہ وغیرہ کی تاویلات تھیں لیکن نیاز، سرسید سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے خود خدا کو بھی عقلی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور خدا کے وجود کے اثبات و عدم اثبات پر

---

[1] بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۲۰۲ ۔ [2] حیات جاوید صفحہ ۲۶ ۔ [3] محشر ۱۸۸۸ء میں جاری ہوا۔ [4] محشر میں ۱۶۸

کئی بحثیں کی ہیں اور آخر یہ کہا ہے کہ خدا کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ نیاز صاحب کے ہاں خدا کی تعریف مولویوں کی عام مروجہ تعریف سے مختلف ہے۔ وہ مولویوں کے خدا کا مذاق اڑاتے ہیں کہ انھوں نے اپنی شکل میں ایک بھاری بھرکم غضب ناک آنکھوں والا قہار بادشاہ اختراع کر رکھا ہے۔ جو دنیا کو تباہ و برباد کرنے سے اور انسان کو عذاب دینے سے خوش ہوتا ہے۔ جس کا کوئی اصول اور قانون نہیں بدکار مسلمانوں کو عقیدہ کی وجہ سے بخش دے اور نیک غیر مسلموں کو عذاب دے۔ نیاز، خدا کو محض ایک قوت سمجھتے ہیں۔ جس نے یہ دنیا پیدا کی۔ جس کو نہ عبادات کی ضرورت ہے نہ خوشامد کی جو نہ کسی کو بہشت عطا کرتا ہے اور نہ سزا دے کر دوزخ میں ڈالتا ہے۔ نیاز اس خیال کے پیرو ہیں کہ انسان جو کچھ کرتا ہے۔ اس کا پھل اسے اس دنیا میں مل جاتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ برائی کرنے سے جو ذہنی اذیت ہوتی ہے وہی انسان کا دوزخ ہے۔ اچھے کاموں سے جو فرحت نصیب ہوتی وہ بہشت ہے۔

اس کے بعد ایک عجیب بحث قرآن کے متعلق ہے کہ قرآن واقعی خدا کا کلام ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کا کیا مفہوم ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کے ماخذ پر بھی بحث کی گئی ہے اور یہ چیز اردو ادب میں اس سے پہلے شاید کبھی موضوع بحث نہیں بن سکی تھی۔ باقی مذہبی مضامین۔ جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا ہے۔ بہ اعتبار موضوعات سرسید سے بڑی حد تک مماثل ہیں۔ لیکن نیاز کا دائرہ سرسید کی بہ نسبت وسیع تر ہے۔

نیاز اور سرسید کے مذہبی مضامین میں بنیادی فرق جو محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ سرسید کا انداز ترغیبی ہے۔ اور نیاز کا بالعموم مجادلانہ۔ چوٹیں سرسید بھی خوب کرتے ہیں۔ لیکن نیاز کا طرز زیادہ سخت ہے۔ سرسید بھی الزامات کا جواب دیتے تھے۔ لیکن نیاز کے جواب سوالیہ ہوتے ہیں۔ اور ان کی مدافعت میں اقدام کا جذبہ زیادہ کارفرما ہوتا ہے۔

ایک اور فرق یہ ہے کہ سرسید کی عقلیت پرستی میں ایک گرمجوشی اور رکھائی پائی جاتی ہے۔ سیدھی سی عبارت میں وہ اپنے مقاصد کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں جذبات کی آمیزش سے اکثر پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن نیاز کے تعقل میں بھی جذبیت پوری طرح جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ وہ کہیں خطیبانہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور کہیں ویسے ہی تلخ ہو جاتے ہیں۔ جس سے مضامین میں ایک سکون اور نرمی نہیں رہتی۔ یہ دراصل ان کی طبیعت کا اقتضا ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"اس سوال کا جواب سورج کے طلوع و غروب سے نہ چاند کے ایاب و ذہاب سے پوچھو۔ آبشاروں کی روانی اور دشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو، پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔"

"موسموں کا باقاعدہ تغیر و تبدل، بہار و خزاں کا ظہور و خفا، نباتات کی بوقلمونی، وحوش و طیور کی طبیعی نیرنگی، نوع انسانی کے قوائے کامل، فضائے بسیط کے ستارے، کائنات کی لامتناہیت وسعت، خور و شبنم، ذرہ و آفتاب اور ان سے فروتر انسانی مساعی کی مختلف صورتیں (جن کا نام ہم نے علم طبقات الارض۔ علم الجبر۔ علم الافلاک۔ علم الکیمیا، علم وظائف الاعضاء۔ علم الحیات۔ نفسیات وغیرہ رکھا ہے) بتائیں گی کہ کوئی ایسی قوت ہے جس کے سمجھنے سے ہم اپنی عقل کو عاجز و بے بس پاتے ہیں[1]۔۔۔۔۔۔۔۔"

اس کے علاوہ ان کی بحثوں میں بھی تلخی آجاتی ہے۔ مثلاً علماء اور مولویوں کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"ان میں باہم دگر ایسی حریفانہ کشمکش پائی جاتی ہے کہ عوام کے لئے یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کس کے خارص پر اعتبار کیا جائے جمعیت العلماء کانپور کی ہدایت پر عمل کیا جائے یا جمعیت العلماء دہلی کے مشورہ پر۔ لیکن اگر یہ اختلاف و تصادم نہ ہو تو بھی ان کے وجود کا کوئی افادی پہلو ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ اگر شہر کے بیشتر معمار اور

---

[1] من و یزدان اول ص ۴۔

کفش دوزباقی نہ رہیں تو لوگوں کو واقعی تکلیف پہونچے۔ لیکن اگر مولویوں کی جماعت فنا ہوجائے تو قوم کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے[1]۔۔۔"

اور پھر یہ کہ سرسید کی طرح سیدھا سادہ طریقۂ بیان اختیار نہیں کرتے بات کو طرح طرح سے اور رنگین بناکر پیش کرتے ہیں، مثلاً:

"اے خدا اس وقت بھی جب قرونِ مظلمہ کی دنیا تجھے صرف آگ برسانے والا دیوتا سمجھتی تھی۔ مجھے تیرے دونوں ہاتھ لطف اور راحت کے پھولوں اور عطوفت کے ہاروں سے لدے ہوئے نظر آتے تھے[2]"، حالانکہ سرسید ہوتے تو یہی کچھ کہتے کہ وہ لوگ تجھے ظالم سمجھتے تھے اور میں مہربان۔

لیکن ان مضامین کے لئے مضامین سے زیادہ مقالات کا نام زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ مضمون میں کسی موضوع کا وضاحت سے بیان ہوتا ہے۔ اور مقالے میں لکھنے والے کا اس موضوع کے بارے میں اپنے خیالات کا بیان اس لئے مضمون بالعموم غیر شخصی ہوتا ہے جس کی مثالیں ان کے ہاں بھی ہیں جو ابھی پیش کی جائیں گی لیکن مقالے میں شخصی رنگ زیادہ پایا جاتا ہے۔ مقالہ نگار اپنے موضوع کے بارے میں جو بھی تحقیق و تفتیش کرتا ہے اس سے درحقیقت اپنے نظریہ کو تقویت دینا اور اپنے دعوے کا جواب پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہی چیز سرسید کے مضامین کے بارے میں کہی جاسکتی ہے کہ وہ مضامین سے زیادہ مقالے ہیں۔

اس کے بعد مضامین کی وہ قسم ہے جسے علمی، تاریخی اور تنقیدی تین حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے علمی مضامین سے مراد یہاں وہ مضامین ہیں جن میں بعض کے اکتشافات پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً "داستانِ ابر و باد"۔ "دنیا کی سب سے بڑی دوربین"۔ "دنیائے آب کی کہانی" "شعاعوں کے حیرت انگیز استعمالات" وغیرہ اور کچھ وہ مضامین ہیں جنھیں فلسفیانہ مضامین کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً "فلسفہ زمانہ پر ایک نظر"، "وقت و زمان کی حقیقت"۔ اور بعض عام اطلاعی مضامین ہیں۔ جیسے "مغرب کا نظامِ تعلیم"۔ "صحافت مغرب کی حیرت ناک داستان" "تمدنِ جدید کی دردناک داستان"۔ "عورت کے ساتھ دنیا کا سلوک[3]"۔ "عورت اہلِ فارس کے نزدیک[4]" وغیرہ۔ اس کے بعد وہ مضامین ہیں جنھیں عہدِ گزشتہ سے متعلق مختلف اطلاعات بہم پہونچائی گئی ہیں۔ ان مضامین کو تاریخی مضامین کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً "زنگباری یا حبشی جماعت کے دلچسپ حالات"۔ "باب و بہا"۔ "اندلس کے آثارِ علمیہ[5]"۔ "فرانس کی اعاظم پرستی"۔ "فراعنۂ مصر کی خوابگاہیں"۔ "دوصنمیات یونان و روما"۔

نیاز کے مضامین میں کثرتِ تعداد کے لحاظ سے مذہبی مضامین کے بعد سب سے زیادہ اہمیت ان کے تنقیدی مضامین کو دی جاسکتی ہے۔ ان مضامین میں انھوں نے ادب کے متعلق، بالخصوص شعر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ مضامین کچھ تو انتقادیات حصۂ اول و دوم اور مابعد و ماعلیہ میں شامل ہوکر کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں، اور کچھ ابھی نگار کے پرچوں میں منتشر ہیں، ان مضامین میں بیشتر ان کی تنقیدی آرا ہیں۔

آخر میں ان مضامین کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ جو اپنے خصائصِ صنفی کے لحاظ سے سب سے پہلے مذکور ہونا چاہئے تھے۔ یہ مضامین کی وہ قسم ہے جنھیں رومانیت کا حامل کہا جاسکتا ہے۔ اور جو انشائے لطیف میں شمار ہوسکتے ہیں۔ ان مضامین میں سے اکثر نگارستان کے مجموعہ میں شائع ہوچکے ہیں۔ یہ اس دور کے مضامین ہیں جبکہ نیاز کی طبیعت ٹیگور سے زیادہ متاثر تھی۔ اس زمانہ میں سید سجاد حیدر یلدرم اپنے رومانی افسانوں کی تصنیف میں مشغول تھے۔ خود نیاز کے وہ افسانے جو انھوں نے اس دور میں لکھے۔ مثلاً "کیوپڈ و سائیکی"۔ "قربانگاہ حسن[6]" وغیرہ ان رومانی مضامین میں کوئی علمی۔ ادبی۔ تنقیدی۔ تاریخی بحثیں نہیں ہیں۔ بلکہ احساساتِ لطیف و جذباتِ رنگین کا بیان ہے۔ مصنف کسی منظر قدرت کے دیکھتا ہے۔ وہ چمن ہو۔ اس کی بہار، ابر ہو قافلہ و صحرا ہو یا طلوع و غروبِ آفتاب و مہتاب، نغمہ آہنگ ہو یا حسنِ رقص و طرب۔ غرض ہر چیز ایک حسن کی حامل دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر ذرہ میں کیف و مستی کی دنیائیں آباد نظر آتی ہیں۔ مصنف ان مناظر میں محو ہوجاتا ہے اور اپنے خیالات کی دنیا میں آباد ہوکر اپنے دل سے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے۔ اس طرح اپنی تمنائیں۔ اپنی آرزوئیں، اپنا درد اور اپنا سوز لطیف پیرایہ میں اور

---

[1] من و یزداں اول ص ۳۴۵ ۔ [2] من و یزداں اول ص ۱۰۷ ۔ [3] مطالعاتِ نیاز ۔ [4] تاملاتِ نیاز ۔ [5] تاملاتِ نیاز ۔

دل آویز انداز میں پیش کرتا ہے۔ ان مضامین میں درحقیقت نیاز نے نثر میں شاعری کی ہے۔ شاعری کیا ہے۔ جذبات و احساسات کا ایک پیرایۂ لطیف کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ وصف ان مضامین میں پوری طرح جلوہ گر ہے اور ایک شاعرانہ روح ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاری و ساری ہے۔ ان مضامین میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں :- "ایک رقاصہ سے"۔ "برسات"۔ "ایک قافلۂ صحرا کو دیکھ کر"۔ "طلوع آفتاب سے پہلے"۔ "سرزمینِ دکن کی ایک دلنواز شام"[1] وغیرہ۔

اس نوع کے مضامین اور افسانوں کو دیکھ کر اُردو ادب کے نقادوں نے نیاز فتحپوری کو ادب برائے ادب کا علم بردار قرار دیا تھا۔ جیسے عزیز احمد نے لکھا ہے کہ اگر جدید اُردو ادب میں واقعًا ادب برائے ادب کسی کا مسلک رہا ہے، تو نیاز فتحپوری کا[2]۔ لیکن اس رائے کا اطلاق نہ تو ان کے تمام مضامین پر کیا جا سکتا ہے اور نہ تمام افسانوں پر۔ ہاں شروع شروع میں نیاز کی روش ایسی ہی تھی۔ جس میں بعد ازاں خاصی تبدیلی واقع ہو گئی۔ جیسا کہ ان کے مضامین کی مختلف اقسام سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے علمی، ادبی، تاریخی مضامین کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ان مضامین کی ساخت کا جہاں تک تعلق ہے۔ ان میں اپنی نوع کے اعتبار سے ایک دوسرے کی بہ نسبت تفاوت پایا جاتا ہے، مثلاً مذہبی مضامین میں چونکہ نیاز اپنے عقائد۔ احساسات اور تصوراتِ مذہبی بیان کرتے ہیں۔ اس لئے وہاں وہ مضمون کی ساخت کے بارے میں کوئی احتیاط عمل میں نہیں لاتے۔ مثلاً تمہید، نفس مضمون کی ساخت کے بارے میں کوئی احتیاط عمل میں نہیں لاتے۔ مثلاً تمہید، نفس مضمون اور انجام = چیزیں اپنے اقتضائی مقام اور اہمیت کی مالک نہیں ہیں۔ تمہیدیں عام طور پر طویل ہیں۔ "روایات و معجزہ" "کورانہ تقلید" "خدا ہے یا نہیں ہے" کی قسم کے مضمون بطور نمونہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کورانہ تقلید میں قریبًا ۳/۴ حصہ تمہید پر مشتمل ہے۔ اور ۱/۴ حصہ کورانہ تقلید کے موضوع پر "خدا ہے یا نہیں ہے" کے مضمون میں خدا کے وجود و عدم پر کوئی فلسفیانہ یا عقلی دلیل پیش نہیں کی گئی۔ شروع میں یہ کہا گیا ہے کہ سورج، چاند، پہاڑ، آبشار، دشت و صحرا کی ویرانی سے پوچھو۔ اسی طرح وحوش و طیور سے خدا کے وجود و عدم کے بارہ میں استفسار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یعنی عجیب خطیبانہ اور شاعرانہ طرزِ بیان اور طریقہ استدلال ہے پھر اس کے بعد یہ ہے کہ خدا کو پیش کس طرح کیا جاتا رہا ہے اور از روئے اسلام خدا کا تصور کیا ہے۔ یعنی اس میں جو بھی بحث ہے۔ اس سے ہٹ کر ہے، کہ خدا ہے یا نہیں ہے۔ مضمون کے اختتام سے قبل وطن کا مسئلہ زیر بحث لایا جاتا ہے۔ کہ ہم وطن کو جمیل کہتے ہیں، جب وہ قوی ہوتا ہے۔ ہم اُسے عظیم کہتے ہیں جب اس کے افراد مہذب اور شائستہ ہوتے ہیں یہ قول TARDE کی کتاب المنطق الاجتماعی سے نقل کیا گیا ہے۔ پھر اس کا انجام اس طرح ہے کہ سرزمین ہندوستان بھی جمیل تھی۔ جب کرشن کی تعلیم نے حریت و آزادی کی روح پھونک رکھی تھی اور اب ہندوستان پر غیر حکومت کا قبضہ ہے اور ہندوستان کی آزادی کے طلب گار اپنے فطری اور ملکی خصوصیات کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مضمون کا اپنے عنوان سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہے[3]۔

علمی اور اطلاعی مضامین جو اکثر ترجمے ملخصات یا ماخوذات معلوم ہوتے ہیں۔ مضمون کی ٹیکنیک پر پورے اُترتے ہیں۔ کیونکہ ان مضامین میں نیاز کے خیال کی جولانیاں ایک خاص نہج کی پابند ہو جاتی ہیں اور اس طرح وہ جذبات کی رو میں بہہ کر حدود کو توڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ یہاں خیال سے بحث نہیں ہوتی بلکہ ٹھوس حقایق کا بیان ہوتا ہے۔ فرق موضوع کے تقاضوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر موضوع ہی دنیا سب سے بڑی دور بین ہو، اور مضمون خود اپنے ذہن کی پیداوار نہ ہو۔ بلکہ ماخوذ ہو تو ظاہر ہے کہ شاعری کی گنجائش باقی نہیں رہتی مثلاً "علم الافلاک کے بعض دلچسپ حقایق" میں مضمون کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ پہلے یونان کے جن حکما نے کرۂ ارض اور سیاروں کے بارہ میں غور کرنا شروع کیا ان کا ذکر ہے۔ پھر اس زمانہ کی تحقیقات کے پیشِ نظر زمین کے قطر، حجم۔ دنن کا مقابلہ زہرہ، عطارد وغیرہ سے کرتے ہیں

---

[1] نگارستان ص - [2] ترقی پسند ادب ص ۱۷ - [3] من و یزداں صفحہ ۳

پھر عطارد۔ زہرہ۔ مریخ۔ مشتری۔ زحل۔ آفتاب وغیرہ کے بارہ میں جو معلومات ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور اسی ضمن میں مختلف لوگوں کی آراء بھی نقل کی ہیں کہ ان کروں کی ساخت کیسی ہے۔ ان میں کوئی زندگی ہے یا نہیں۔ ان تک پہونچا جا سکتا ہے یا نہیں وغیرہ۔ ان حقایق کو معلوم کرنے میں دوربین اور لاسلکی وغیرہ سے جو کام لیا جا رہا ہے یا لئے جانے کی توقع ہے۔ اس کا ذکر کیا ہے اور اس پر مضمون ختم ہو جاتا ہے[1]۔

ان علمی اور معلوماتی مضامین کو چھوڑ کر باقی تمام مضامین خواہ وہ مذہبی مضامین ہوں یا تنقیدی، نیاز کے ذاتی رجحانات و خیالات کے حامل ہیں۔ اور اس طرح جذبات استدلال سے زیادہ کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ تنقیدی مضامین جو خالص ادبی ہوتے ہیں۔ ان میں بھی نیاز اپنی رائے سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتے۔ موضوع خواہ غزل ہو یا عام شعر یا بذاتِ خود "تنقید" وہ اپنی پسند و ناپسند کو سامنے رکھتے ہیں اور عام مروجہ اصولوں کی بہت کم پروا کرتے ہیں۔

وہ تنقید کرتے وقت رد و قبول کے پیمانے خود اپنی جانب سے اختراع کرتے ہیں۔ اور انہی کے مطابق حکم لگاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض وہ اصول جو کبھی انھوں نے اپنے خطوط میں بیان کئے ہیں۔ یا دیگر تنقیدی مضامین میں جن میں وہ شاعری یا ادب کو جانچنے کے لئے معیار اور طریقے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن تنقید کرتے وقت وہ خود اپنے ہی اصول کی خلاف ورزی کر جاتے ہیں۔

رہے وہ مضامین جنھیں ہم ان کے رومانی مضامین کہتے ہیں وہ ان کے شخصی جذبات و احساسات کے آئینہ دار ہونے کی وجہ سے کسی ٹیکنیک کے پابند نہیں ہیں کیونکہ ان مضامین میں وہ کسی موضوع پر بحث نہیں کر رہے ہیں۔ وہ اپنے احساسات کے بیان میں کھو جاتے ہیں۔ اور شروع سے آخر تک ایک ہی طرح کی لے جاری رہتی ہے۔ جہاں جہاں ان کے خیال کا سلسلہ ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ چلے جاتے ہیں اور جو جو چیز انھیں اس وقت سوجھتی ہے۔ اس کو بیان کر دیتے ہیں۔ اور یہ سارا عمل کسی اصول یا نظام کا پابند نہیں ہوتا OPHAM اور ہم ایسے مضامین کو LYRIC جذباتی نظموں سے مماثل قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی چیز مثلاً کسی کی کتاب کا کوئی فقرہ کسی مکالمے کا کوئی جزو۔ خیال کے اس سلسلہ کو بیدار کر دیتا ہے یا مصنف کے دل میں کسی مطلوب تجزیہ کے قابل نقطۂ نظر کو برق پاش کر دیتا ہے[2]۔ اس کے بعد اور ہم بطور مثال لیمب LAMB اور ہیزلٹ HAZLITT کے ایک دو مضامین کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

نیاز نے رومانی مضامین بھی کسی واقعہ یا منظر سے متاثر ہو کر لکھے ہیں اور ان میں اپنے خیالات کے سلسلہ کو بے کم و کاست بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ "ایک رقاصہ"۔ "ایک شب کی قیمت"۔ "عورت"۔ "برسات"۔ "ایک قافلۂ صحرا کو دیکھ کر"۔ "طلوع آفتاب سے پہلے"۔ "سرزمین دکن کی ایک دلنواز شام" وغیرہ اس قسم کے مضامین ہیں۔ اپنے مضمون "ایک رقاصہ" کو شروع ہی ایسے کرتے ہیں کہ رقاصہ کو دیکھنے سے جو ردِ عمل ان پر ہوا۔ اس کا تذکرہ شروع کر دیتے ہیں اور پھر خیالات کی رَو میں بہ جاتے ہیں۔ اس مضمون کو وہ اس طرح شروع کرتے ہیں "اے رقاصہ تو اپنا رقص کر میں منع نہیں کرتا۔ مگر مجھے اپنی محفل سے اُٹھ جانے دے کہ میں تیرے رقص کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میری طبیعت بگڑتی ہے۔ اے مغنیہ تو گا میں نہیں روکتا۔ مگر خدا کے لئے مجھے اپنی بزم سے چلا جانے دے ..... جب تو اپنے سانچے میں ڈھلے ہوئے مجسمۂ ذی حیات کی کشیدہ قامتی اور اپنی قد آدم تصویر کی رعنائی کو لے کر محفل میں کھڑی ہو جاتی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اس فتنۂ سرکش اس سحر خوش قامت۔ اس قیامتِ بلند و بالا کو نہ دیکھوں، مگر دیکھتا ہوں اور کانپتا ہوں۔ جب تو اپنی آواز میں ایک داد خواہ بیچارگی ایک مسترحم نشیب پیدا کر کے اپنے نغمہ کو میرے دل کی سب سے پنہاں رگ میں ڈبوتی جاتی ہے۔ تو میں چاہتا ہوں کہ اس صدائے بے پناہ کی طرف

---

[1] مطالعات نیاز ص ۲۳۱

[2] TYPICAL FORMS CEENGISH LITERATURE ص ۱۴۲

سے اپنے کان بند کرلوں۔ لیکن ایسا نہیں کرسکتا۔ سنتا ہوں اور تڑپتا ہوں ۔۔۔۔۔ جس وقت تو اپنے حنائی پاؤں میں سے ایک پاؤں کو زمین پر قایم رکھ کر دوسرے پاؤں کی ایڑی اُٹھا کر صرف پنجہ کی ہلکی ہلکی ٹھوکر سے اپنی گھنگروؤں کی آواز کو تال و سم کے ساتھ ملا کر موا میں منتشر کر دیتی ہے تو میں اس منظر سے جان بچا کر کسی طرف نکل جانا چاہتا ہوں۔ مگر نہیں نکل سکتا ۔۔۔۔۔ پھر ۔۔۔۔۔ اگر میں تیرے رقص سے جس کو میں خرام نغمہ یا نغمۂ خراماں کہہ سکتا ہوں۔ کانپتا ہوں، ڈرتا ہوں تو مجھے معذور سمجھ کہ واقعی میری کمزور طبیعت اس کی تاب نہیں لاسکتی۔ لیکن اگر تجھے مجھ سے ضد ہے۔ تو میرا کہنا نہیں مانتی تو تو صرف ایک کام کرے گا مگر رقص نہ کر ہر چند تیرا نغمہ بھی مجھے ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور میری روح کو اندر ہی اندر تحلیل کرسکتا ہے۔ جب تو آمادۂ رقص ہوتی ہے۔ اور ساز کی تال سم کے ساتھ تیری بوٹی بوٹی پھڑکنے لگتی ہے، تو میں بھی اپنے اعضا میں جنبش محسوس کرتا ہوں۔ اور بے اختیار یہ چاہنے لگتا ہوں کہ میں بھی تیرے ساتھ رقص کروں ۔۔۔۔۔" نیاز اسی طرح خیالات میں کھوئے ہوئے تھے کہ انھیں یک دم خیال آگیا کہ اس رقاصہ تک تو ہر کسی کی رسائی ہے۔ اس سے تخیلات کا دھارا دوسری طرف مڑ جاتا ہے اور وہ کہنے لگتے ہیں:۔

"ہر چند میری روح تیری نگاہوں کے ان ہلکے ہلکے جرعوں کے لئے تشنہ ہے۔ مگر وہ تشنہ ہی رہے گی۔ کیونکہ انھیں ہر شخص چکھ سکتا ہے۔ اور میں اس لذت کو صرف اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی جوانی کا وہ نشہ جو تیرے بستر کی شکنوں پر ہر شخص کو میسر آسکتا ہے مجھ پر نہ ڈال۔" پھر ان کا خیال صنعت کاری کی طرف چلا جاتا ہے۔ اور کہنے لگتے ہیں کہ لوگ تیرا رقص نہیں دیکھتے بلکہ تجھے حالتِ رقص میں دیکھتے ہیں۔ اس لئے تو اُنسے بچ۔ ان لوگوں کی مثال اُس بچے کی سی ہے۔ جو ہر تتری پر جان دیتا ہے۔ مگر جب اسے پا جاتا ہے تو مل کر پھینک دیتا ہے۔ تیری دو حیثیتیں ہیں۔ ایک صرف عورت ہونے کی۔ یعنی تیری نسائیت کی، اور دوسری صرف تیرے رقاصہ اور مغنیہ ہونے کی۔ اور ان دونوں حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھ۔ تو صرف اس وجہ سے نغمہ و رقص کو اختیار نہ کر کہ عورت ہے تو صرف اس لحاظ سے اس فن کی نمائش نہ کر کہ تیری نسائیت میں اس سے زیادہ دلکشی و دلربائی پیدا ہو جاتی ہے بلکہ تو گا محض گانے کے لئے، رقص کر صرف رقص کی غرض سے، تو اگر عصمت فروش ہے تو ہو مگر اپنے فن کی معصومیت کو مجروح نہ کر تو اس کے ذریعہ سے اپنے بازارِ حسن کو رونق نہ دے۔ کوئی قایل ہو یا نہ ہو۔ مگر میں تو قایل ہوں کہ تیرا رقص معجزہ ہے اور میں اس معجزہ پر ایمان لانے کے لئے طیار۔ لیکن کاش اس معجزہ سے تو صرف معجزہ کا کام لیتی اور کوئی قیمت اس کی مقرر نہ کرتی۔ کیونکہ جس وقت صنعت بازار میں آجاتی ہے۔ صنعت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ وہ بازار کی ایک جنس ہو جاتی ہے۔ جو لاکھ گراں ہونے پر بھی کم قیمت ہے۔ اور پھر اس سے التجا کرنے لگتے ہیں کہ "اپنے لبوں کی شراب چھلکا مگر ہر کسی کو نہ چکھنے دے۔ اور ہر بازو کو کمر کا احاطہ کرنے کی اجازت نہ دے کیونکہ لہروں کے لئے ساحل کا وجود قطع روانی ہے۔ الغرض تو جو چاہے بن مگر رہ آزاد و رمیدہ، آغوش سے دور معانقہ سے الگ اور پھر مجھ سے پوچھ کہ تو کیا ہے دنیا کی پروا نہ کر اس کے اصول پر نہ جا اور وہ کر جو میں کہتا ہوں پھر تو یہ میرا کام ہے کہ تیرے مجسموں کی پرستش عالم کے ہر ہر گوشے میں اور تیری خدائی ساری دُنیا میں قایم کردوں۔ اب تجھے اختیار ہے۔ خواہ پرستیدۂ عالم بن یا پرستارۂ دنیا۔"[1]

من حیث المجموع نیاز کے مضامین اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اندازِ بیان کے لحاظ سے بھی اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے بھی۔ ان کے مضامین پڑھتے ہوئے یکسانی کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ جس سے پڑھنے والا بیزار ہو جائے یا اکتا جائے۔ کہیں تاریخ کے مسئلہ پر بحث ہے۔ کسی مقام پر شرع کا کوئی حکم پیشِ نظر ہے۔ کسی موقع پر جنت و دوزخ کا معاملہ متنازع فیہ ہے۔ کہیں واردات عشق و محبت سے واسطہ ہیں۔ اور کسی جگہ خالص سائنس کے کمالات پر اظہارِ خیال ہے۔ الغرض موضوعات محدود نہیں۔

ان میں سائنس اور فلسفہ و تاریخ سے تعلق رکھنے والے مضامین کا حصّہ اکثر ناخوذ ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر زبانوں کے جواہر سے اُردو زبان کا دامن بھرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ اُردو زبان کی بہت بڑی خدمت ہے۔ زبانیں اسی طرح ترقی کرتی ہیں۔ کیونکہ تراجم و مانوذات سے جہاں مختلف معلومات حاصل ہوتی ہیں وہاں ہزاروں الفاظ بھی ساتھ ہی چلے آتے ہیں۔ اسی طرح بذاتِ خود زبان کی لفظی حیثیت بھی

---

[1] نگارستان ص ۴۷، ۵۷

اضافہ ہوتا ہے۔

نیاز کی نثر نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت روانی اور برجستگی ہے۔ وہ بعض اوقات مشکل الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ کسی کسی موقع پر نئی ترکیب بھی اختراع کرتے ہیں۔ جو ذہنوں سے قریب نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود عبارت ایک تیز رَو دریا کی طرح ٹھاٹھیں مارتی چلی جاتی ہے جو بھی باعثِ دلچسپی ہوتا ہے اور مطالعہ کرنے والا لطف حاصل کرتا ہے۔

نیاز کے مضامین ایک اور اعتبار سے بھی اہم ہیں، بالخصوص وہ مضامین جن میں مذہبی مباحث ہیں وہ اس طرح کہ انھوں نے کچھ لکھا اسکے جواب میں دوسروں نے لکھا اور بحث چل کھڑی ہوئی۔ فرنگی محل والوں نے اعتراض کیا۔ دارالمصنفین والے برسے۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی سے نوک جھونک ہوئی، اس بحث کا حاصل مذہبی، شرعی یا تاریخی طور پر مفید ہو یا نہ ہو اور نیاز کا موقف غلط ہو یا صحیح لیکن اس چیز سے انکار ممکن نہیں کہ اس سبب سے کتنے ہی نئے مضامین کا اُردو میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے نیاز کے مضامین کی حیثیت بھی سرسید کے مضامین کی سی ہو جاتی ہے۔ سرسید کے مضامین جو تہذیب الاخلاق میں چھپے ان کی تعداد ان مضامین کا عشر بھی نہ ہوگی جو ان کے جواب میں لکھے گئے۔ غرض نیاز کے مضامین کا اُردو ادب کی ترقی میں ایک نمایاں حصہ ہے۔

(ادبی دُنیا)

محمد خورشید عاصم

رعایتی قیمت

تصانیف نیاز فتحپوری

من و یزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — جمالستان — نگارستان — شہوانیات
۸ر — ۸ر — ۸ر — ۸ر — ۸ر

مکتوبات نیاز تین حصے — انتقادیات — حسن کی عیاریاں — مالہ و ماعلیہ — شہاب کی سرگزشت
۱۲ر — ۸ر — ۸ر — ۸ر — ۸ر

فلاسفۂ قدیم — مذاکرات نیاز — فراست السید — مذہب — نقاب اُٹھ جانے کے بعد
۸ر — ۸ر — ۸ر — ۸ر — ۸ر

میزان
۳ر

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

"پیامِ کیف" میری نظر میں

مشہور ادیب و نقاد مرزا احسان احمد صاحب احسان اعظم گڑھی کا مجموعۂ کلام "پیامِ کیف" میرے سامنے ہے۔ احسان صاحب لکھنوی دبستاں کی بے روح شاعری کو ہمیشہ سے بُرا کہتے آئے ہیں۔ وہ اصغر گونڈوی مرحوم کے حد سے زیادہ عقیدت مند ہیں اور ان کی رائے میں تغزل کا صحیح معیار یہ ہے کہ اس سے روح کو سرمایۂ نشاط حاصل ہو۔ ان کا خیال ہے کہ سوزِ غم بجائے خود پیامِ کیف ہے اور اس سے دل میں کیفِ محبت کا اضافہ ہونا چاہیئے۔

لکھنؤ کے دبستانِ شاعری پر ایک دور ایسا گزرا ہے جس میں غم کی ہر لے "آوازۂ مرگ" کے تاثرات پر ختم ہوتی تھی اور یہ رنگ اتنا غالب ہوگیا تھا کہ ہر شاعر ڈوبتی ہوئی نبضوں سے لے کر کافور کفن تک ہر منزل کا پورا پورا بیان کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ پھر چونکہ لکھنؤ میں اس وقت خاص حالات کی بنا پر ایسا ماحول تھا جس میں ہر چیز غلط جذباتیت اور تصنع کے رنگ میں رنگ چکی تھی۔ اس لئے آہ صبح گاہی کے بجائے "گریۂ نیمروز" اور فغانِ نیم شبی کے بجائے "نالۂ سرِ مجلس" نے سند قبول حاصل کی۔ طبیعتوں کو عشق کے اضطراب پنہاں کے بجائے لاش و کفن کے بیان میں زیادہ دلکشی معلوم ہوئی اور لوگوں نے تصویرِ درد بننے کے بجائے "نخلِ ماتم" بننا زیادہ پسند کیا۔ آپ اس دور کے کسی لکھنوی غزل گو کا دیوان اُٹھا لیجئے اس میں ایک بات صاف طور پر معلوم ہوگی کہ غمِ محبت کا تعلق اضطرابِ دل کے بجائے رنگِ روئے بیمار سے ہے اس رنگ تغزل کا ردِ عمل بہت جلد ہوا، اس اعتبار سے احسان صاحب کا یہ کہنا کہ:

ہزار صنعتیں ایجاد لکھنؤ نے کیں سرورِ روح کا لیکن نشاں نہیں ملتا

کچھ غلط نہیں ہے۔ اس لئے مرزا صاحب نے ہر جگہ سختی سے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ تغزل میں غمِ محبت کا ایسا بیان ہو جس سے پاکیزگیِ محبت میں مدد ملے اور جو محبت کرنے والے دل کو دل حسرت زدہ بنانے کے بجائے جذباتِ کیف سے لبریز کر دے۔

احسان صاحب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب و نقاد بھی ہیں۔ ان کو تو یہ بات معلوم ہونا چاہیئے کہ سوز و گداز غزل کا ایک بنیادی عنصر ہے۔ محبت کا تعلق اگر اسی دنیائے آب و گل کے کسی سانس لیتے ہوئے محبوب سے ہے تو اس کے بیان میں مختلف النوع جذبات کا اظہار لازمی سا ہے۔ ایک محبت کرنے والا شکوۂ ہجر سے لے کر نشاطِ وصل اور دردِ اضطراب سے لے کر مسرتِ یقین تک کی ہر منزل سے گزرتا ہے۔ اور وہ ان سارے جذبات کو پرجوش انداز سے بیان کرتا ہے۔ اب اگر آپ اس سے مطالبہ کریں کہ وہ نشاطِ وصل یا یقینِ وعدہ کی مسرت کا تو بیان کرے، لیکن غمِ ہجر کا بیان نہ کرے۔ یا پھر اس کو اس طرح بیان کرے کہ اس سے "بوئے خوں" نہ آتی ہو، تو یہ ایک غیر معقول مطالبہ ہوگا۔ سوز و گداز اور گداختگی و برشتگی عشق کی سب سے زیادہ مشتعل کیفیت ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ جذبہ جو بہ نسبت دوسرے جذبات کے زیادہ متاثر کرنے والا ہے۔ اس کا بیان اس طرح کیا جائے کہ اس میں سے دل دکھا دینے والے عناصر ختم ہو جائیں۔

اصل میں ایسے مقامات پر ایک دلچسپ مغالطہ ہو جاتا ہے، محبت کے مختلف مدارج ہیں۔ بعض لوگ اپنی ہی جنس کے کسی فرد سے محبت کرتے ہیں۔ کچھ لوگ انسانی مادیت سے دامن کش ہو کر ذاتِ قدسی صفات کی وسعتوں میں گم ہو جانا پسند کرتے ہیں اور بعض لوگ ایسے ہیں جو دنیا کی ہر خوبصورت چیز کے متعلق حرفِ اظہارِ پسندیدگی کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کیفیات کا بیان بھی مختلف ہوگا۔ مثلاً میر کی محبت اسی گہوارۂ غم سے متعلق تھی جسے دنیا کہتے ہیں اور دردؔ و اصغرؔ کی پرواز سدا پردۂ حریمِ قدس کی جانب تھی۔ اب اگر کوئی شخص کہ

کہ میر کا دردِ عشق دردِ اصغر کے عشق پاکیزہ تک نہیں پہونچتا ہے، تو یہ ایک مہمل سی بات ہوگی۔

دبستانِ لکھنؤ کے شعرا کے یہاں جو بیان درد ہے وہ ان میں سے کسی بھی نوع کی محبت سے متعلق نہیں۔ بلکہ اس کو بیان درد کہنا بھی نہیں چاہئے۔ ان شعرا کے یہاں تو ہر چیز تصنع سے گرانبار ہوتی تھی اس لئے ان کے غم کو غمِ محبت سمجھ کر اس پر تنقید کرنا یا اس سے اظہار نفرت کرنا صحیح نہیں ہے، لکھنؤ کے عام ماحول پر عیش و عشرت کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ لیکن عقیدت و رسم کے طور پر ابتدا ہی سے سوگواریت سے دست و گریباں رہنا پڑتا تھا۔ ان دو متضاد و محرکات کے دو مختلف اثرات کارفرما رہتے تھے۔ چونکہ ذہنی طور پر یہ شعرا اس رنگ میں اتنے رنگ چکے ہوتے تھے کہ ان میں دوسرے محرکات کو جزو اعظم کی حیثیت سے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی تھی۔ لہذا مختلف مواقع پر ان دونوں مختلف النوع جذبات کا اظہار ہوتا رہتا تھا اس لئے لکھنوی رنگ تغزل میں صرف بیانِ غم پر اعتراض کرنے کے بجائے اس پورے ادب اور اس کے محرکات پر اعتراض یا گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

احسان صاحب، اصغر مرحوم کے پرستار اور ان کے رنگِ سخن کے شیدائی ہیں۔ اصغر کے یہاں جو نشاط آفریں کیفیت ہے وہ اُردو غزل میں آپ اپنی مثال ہے۔ لیکن اصغر کے یہاں جو نشاطیہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس کا تعلق اندازِ بیان اور تخئیل ملکوتی سے ہے اس کو کیفیات محبت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اصغر اسی دُنیا کے فرد تھے۔ لیکن ان کے تخیلات ہمیشہ لاہوت و جبروت پر پرواز کرتے رہتے تھے۔ ان کے یہاں اس غم محبت کا بیان نہیں ہے، جو دو دلوں کے دھڑکنے سے پیدا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کا غم نشاط روح پیدا کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ ہر غم نشاط روح پیدا کرے تو یہ انسانی نفسیات سے ناواقفیت ہوگی۔

مدعا یہ ہے کہ نشاطیت بہت عمدہ عنصر سہی لیکن حقیقتاً محبت کی قلمرو میں اس کا گزر بہت کم ہوتا ہے۔ احسان صاحب نے لکھنوی شعرا کے یہاں جو بیان غم دیکھا، وہ اس کو واقعی غم محبت کا بیان سمجھئے اور اس طرح انھوں نے طے کر لیا کہ وہ بیان غم جو دل میں المیہ جذبات پیدا کرے مردود ہے۔ اور اصغر کی شاعری سے استناد کیا۔ حالانکہ ان کو سمجھنا چاہئے تھا کہ اصغر کا رنگ سخن ہی دوسرا ہے۔ نیز لکھنوی شاعری کا وہ غم جو مریض کے بستر پر نمایاں ہوتا ہے غم محبت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احسان صاحب کے یہاں ایسے اشعار میں صرف نصیحت ہی نصیحت ہے۔ شعریت و شگفتگیٔ بیان مفقود ہے اور اسی غلط فہمی نے ان کے کلام کو شعری عناصر سے معرا کر کے بے کیفی و بے اثری سے معمور کر دیا ہے۔

جب کوئی شخص کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر کوئی بات کہتا ہے تو اس کو خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں مقصد کے خلاف کوئی پہلو نہ پیدا ہو جائے اس لئے اس کی گفتگو میں وہ بے تکلفی و بے ساختگی نہیں پیدا ہو پاتی جو خلوص کی جان ہے۔ احسان صاحب کے ذہن میں لکھنوی شاعری کی مذمت ہمہ وقت موجود رہی اور وہ قدم قدم پر اس کو برا کہتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑا کہ کہیں ان کے خیالات پر اس قبیل کا کوئی پرتو نہ پڑ جائے۔ اس لئے انھوں نے دوسرے اسالیب اختیار کئے۔ لیکن اس جذبۂ نفرت و ضد کی بنا پر ان کے اندر بے ساختگی نہ پیدا ہو سکی جس کی وجہ سے ان کا سارا کلام شعریت و شگفتگی اور دلکشی و تاثیر سے معرا ہو کر رہ گیا آگے چل کر چند مثالوں سے اس کا صحیح اندازہ ہوگا۔ اگر وہ غم و مسرت کی اس منطق سے کچھ دیر کے لئے قطع نظر کر لیتے تو شاید ان کے کلام میں یہ بے نمکی نہ ہوتی۔

غزل میں حسنِ خیال سے زیادہ حسنِ بیان کا کرشمہ ہوتا ہے۔ خیال کتنا ہی بلند ہو لیکن اگر اس کو مناسب الفاظ میں نہ ادا کیا جائے تو اس کی کوئی قیمت نہیں رہتی ہے۔ خصوصاً جذبات و کیفیاتِ محبت کہ ان کو ادا کرنے کے لئے تو نہایت نرم و نازک لہجے کی ضرورت ہوتی ہے۔ غزل درحقیقت آبگینۂ نازک مزاج ہے۔ جس کی نزاکت کسی ٹھیس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو یہ کمال شیشہ گری نہیں آتا، ان کو اس کارگہ شیشہ گراں میں آنا ہی نہیں چاہئے۔ جناب احسان نے خیال رکھا ہے کہ ان کی غزلوں میں ایسے عناصر نہ آئیں جن سے یاس و الم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی غزلیں گریہ و ماتم سے خالی ہیں۔ لیکن ان میں کیف و نشاط بالکل نہیں ہے۔ جس کی وجہ

اوپر لکھ چکا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی غزلیں اس حسن سے بھی معرا ہیں جو لکھنؤ اسکول کی بے مثل خصوصیت ہے۔

لکھنؤ کی اس مخصوص شاعری میں خیال میں کتنا ہی ابتذال سہی، لیکن اس میں حسن زبان، اسلوب ادا اور طرز بیان کی جو خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ بہرطور قابل لحاظ ہیں۔ احسان صاحب کے یہاں وہ خوبیٔ زبان بالکل نہیں ہے جو دوسرے عناصر کو چمکا دیتی ہے۔ ان کے پورے بیان میں ایک کرخت و درشت لہجہ ہے۔ اور غیر دلکش اسلوب۔ مثال کے طور پر میں بعض اشعار پیش کرتا ہوں۔ یہ وہ اشعار ہیں جن میں انھوں نے علی الرغم دبستانِ لکھنؤ غم محبت کو سرود انگیز بنا کر پیش کیا ہے اور اس راہ کی سختیوں کو تازیانۂ شوق سے تعبیر کیا ہے:

یہ جنوں گاہ عشق ہے بزم عزا نہیں — مستانہ آ ہجوم تمنا لئے ہوئے
کچھ اور کر بلند ذرا ذوقِ عاشقی — غم بھی ہے اک نشاط کی دنیا لئے ہوئے
مستانہ وار مشہدِ اُلفت میں رکھ قدم — چہرہ پہ اک تبسم رعنا لئے ہوئے
مضراب سوزِ غم سے ذرا چھیڑ سازِ دل — ہر تار میں ہے شعلۂ سینا لئے ہوئے

راحتِ روح ملی، دولتِ کونین ملی، — کشتۂ درد و اسیرِ غمِ پنہاں ہو کر
دیکھ پھر ہوتی ہے کیا بارشِ الطافِ کرم — مشہدِ عشق میں آ سرمۂ عریاں ہو کر
وادیٔ عشق میں یہ نالۂ دشیوں کیسا — ہاں اُٹھا گام طلب بے خود و رقصاں ہو کر
کاش رہ جائے جگر میں یہ مرا داغِ جنوں — اک نشاط ابدی کا چمنستاں ہو کر

وہ دل ہے ننگِ محبت کو درد میں جس کو — نشاط زندگیٔ جاوداں نہیں ملتا
کسی شہیدِ محبت سے پوچھ لذتِ غم — کہ بوالہوس کو یہ کیفِ نہاں نہیں ملتا
فسانہ جس سے ہو دل مشتعل ہو جس سے دماغ — وہ اہلِ ذوق کا طرزِ فغاں نہیں ملتا

ان اشعار میں غمِ محبت کا گورستانی بیان نہیں ہے، لیکن وہ نشاط و کیف بھی نہیں ہے۔ جس کا احسان صاحب نے بار بار ذکر کیا ہے کسی شعر کو پڑھ کر دل پہ کوئی اثر نہیں ہوتا، بلکہ اس التزام نے ان کی غزلوں کو شروع سے آخر تک بے کیفی کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ آپ جو غزل دیکھیں گے اس میں بھی یبوست و بے نمکی ملے گی، منتشر اشعار سے شاید اس کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے۔ اس لئے میں ان کی ایک مکمل غزل نقل کرتا ہوں، جس سے یہ رنگ زیادہ واضح ہوگا۔

چھیڑ وہ نغمۂ اے جنوں جس سے ہو روح مشتعل — مست نشاط ہو دماغ ولولہ آفریں ہو دل
پھونک دے اے جمالِ یار خرمنِ آرزو مرا — اپنا مگر دکھا مجھے جلوۂ کیف مستقل
اس کی حریمِ ناز کا پایہ بہت بلند ہے — کم نہیں اپنا بھی مگر حوصلۂ جبینِ دل
اس کی عنایتیں نہاں اسکے ستم میں ہیں مگر — ہو جو نگاہ جلوہ سنج ہو جو ادا شناس دل
تیرے نشاطِ درد کی چاہئے ایک لہر بس — پھر نہ یہ جان ہو ملول پھر نہ یہ دل ہو مضمحل
جس کا ہر ایک ذرہ ہے رقص گہِ جمالِ قدس — ہے وہی آستاں مرا سجدہ گہِ نیازِ دل
ہے وہ شرارِ معنوی ذرۂ خاک میں مرے — جلوۂ روحِ قدسیاں جس سے ہے پست منفعل

احسان صاحب کی غزلوں میں دوسرا بڑا عنصر تصوف ہے اور یہ بھی اصغر کا اثر ہے۔ غزلوں کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس کے اندر حیات و کائنات کے سارے مظاہر کا بیان سما سکتا ہے۔ اور فلسفہ و تصوف کے تمام اسرار و رموز پوری رنگا رنگی کے ساتھ داخل کئے جا سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اندازِ بیان میں شعریت باقی رہے اور مفہوم اس طرح ادا کیا جائے کہ الفاظ اس کا ساتھ دے سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ فلسفہ و تصوف کے مسایل صرف مدعیانہ طرز سے بیان کر دئے جائیں اور غزل کی زبان اور اس کے مزاج کا لحاظ نہ رکھا جائے۔

احسان صاحب تصوف کے دلدادہ ہیں، لیکن کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ ذوق صرف ذہنی لگاؤ کی حد تک ہے وہ چونکہ ایک طرف لکھنؤ کے رنگ سخن سے بیزار ہیں۔ لیکن دوسری طرف اس دل گداختہ سے بھی محروم ہیں جو فطرت کا انعام خاص ہوتا ہے۔ اسلئے وہ حریم تصوف میں پناہ لیتے ہیں۔ تصوف اگر حال سے متعلق ہو تو ایک بلند کیفیت ہے۔ لیکن اگر وہ صرف قال کی حد تک ہو تو پھر شاعر کے حصہ میں اس کی چند اصطلاحات اور غیر شاعرانہ الفاظ ہی آتے ہیں اور وہ اس ارتعاش نغمی سے محروم رہتا ہے۔ جس سے کلام میں گرمی پیدا ہوتی ہے جناب احسان کے کلام میں وہی اصطلاحات ہیں، وہی الفاظ ہیں، اور وہی بعض سمجھ میں نہ آنے والی باتیں۔ لیکن وہ کیفیت نہیں ہے جو تصوف کی جان ہے۔ انھوں نے اصغر کی تقلید میں بیسیوں جگہ لاہوت و ناسوت کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن ان سے کلام کی بے نمکی و یبوست میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ میں مثال کے طور پر ان کے چند اشعار نقل کرتا ہوں۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں جہاں تصوف کا بیان ہے وہاں صرف الفاظ کی درشتگی یا بیان کی ژولیدگی ہے اور کچھ نہیں۔ اور جہاں دوسرے اخلاقی و فکری مسایل کا ذکر ہے۔ وہاں بھی شعریت مفقود ہے صرف پند گستری و سخن بافی باقی رہ گئی ہے۔ غم و مسرت کے جذبات کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے:

دیکھ رہا ہے حسن کے جلوۂ بے مثال کو،
عشق بھی اک لئے ہوئے لذتِ لازوال کو
وہ مہ و مہر میں کہاں شعلۂ برق میں کہاں
جلوہ دیا ہے تو نے جو قلبِ شکستہ حال کو
میری نگاہ شوق کی سحر طرازیاں نہ پوچھ
دیتی ہے خود پیامِ کیف جلوہ گہِ جمال کو
جلوۂ لطف خاص کی ہے یہ نگہ ادا شناس
اور بھی پائمال کر سجدۂ پائمال کو
آئینۂ جمال میں دیکھ رہا ہوں میں ترے،
اپنے ہی آب و رنگ کو اپنے ہی وجد و حال کو

لذت شناس دل جو ہو کچھ سوز و ساز کا،
ہر خار زار فرش ہے گلہائے ناز کا
ادنیٰ سا یہ کرشمہ ہے ذوقِ نیاز کا،
ہر ذرہ محوِ رقص ہے اس بزمِ ناز کا
اک نکتۂ لطیف ہے اس بزمِ ناز کا
ہر نغمہ میرے ٹوٹے ہوئے دل کے ساز کا
اک انبساط روح کی دنیا چمک اٹھی
بھڑکا جو شعلہ تیرے غمِ جانگداز کا
اک لے میں ورنہ تھیں یہ کہاں شعلہ بار یاں
فیضِ اثر ہے خود یہ لبِ نے نواز کا،
جس کو اٹھا کے لے گئی خود رحمتِ ازل
اک سجدہ تھا وہ میرے سرِ بے نیاز کا

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں یبوست و غیر شاعرانہ کیفیت کس حد تک ہے، الفاظ کا ذخیرہ ہے، لیکن شعریت کا پتہ نہیں فارسی تراکیب ہیں، لیکن حسن سے معرا، وہی پامال و فرسودہ خیالات ہیں جو عموماً کتابی تصوف کے سرمست شعرا کے یہاں پائے جاتے ہیں اور جو عموماً حسن ادا و کیف بیان سے یہی داماں ہوتے ہیں۔

یہاں تو ان کی شاعری کا عمومی پہلو تھا، اب میں ان کی شاعری کے ایک خاص حصہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ہر شاعر کے کلام کو سب سے پہلے اس اعتبار سے دیکھا جاتا ہے کہ اس کے اندر محاسن کی کیا نوعیت ہے اور پھر یہ کہ معائب کا کیا حال ہے۔ غلطیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک زبان کی اور دوسری معانی و بیان کی۔ اول الذکر قسم کی غلطیاں مبتدی و نو مشق شعرا کے یہاں ملتی ہیں۔ ہاں دوسری قسم کی غلطیاں بعض اچھے شعرا کا دامن زبان کی معمولی خامیوں سے ضرور پاک ہوتا ہے۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جناب احسان کے اس مجموعہ میں زبان کے ایسے فحش عیوب ملتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔

احسان صاحب شاعر ہونے سے پہلے ادیب، و نقاد ہیں۔ ایک ایسا شخص جو نقد ادب سے ذوق رکھتا ہو اور لوگ اس کی اس حیثیت سے اچھی طرح واقف بھی ہوں۔ اس کے کلام میں کتابی اغلاط سخت تکلیف دہ چیز ہے۔ نقاد تو خوب و زشت کا فیصلہ کرتا ہے۔ لیکن وہ خود ہی ایسے نقایص و معائب سے دست و گریباں ہو جو نہایت درجہ معمولی ہوں۔ تو پھر دوسروں کو کیا کہا جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ کسی ناقد کے

زبان و بیان کی معمولی معمولی غلطیوں کا وجود عام لوگوں کے لئے اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ شعر میں زبان و بیان کی خامیاں ہونا امر لازمی ہے۔ ایسے بعض مقامات کو مختصر اشارات کے ساتھ لکھتا ہوں۔ دیوان کی ابتدا منظومات سے ہوتی ہے۔ پہلی نظم کا عنوان ہے "دعا" فرماتے ہیں:

اِک ذوقِ جنوں مجھے عطا کر پابندیِ ہوش سے رہا کر
ڈوبا ہوا ذوقِ آرزو میں اک ذوقِ نظر مجھے عطا کر

دونوں جگہ اک زاید ہے۔ یہ عیب شاید ان کو اصغر کے کلام کی مداومت سے بطور تاثر ملا ہے۔ کیونکہ اصغر کے یہاں ایسے حشو و زواید کے عیوب عام ہیں:

ہے تشنۂ ذوق روح میری اک میکدۂ نشاط وا کر
اسرار کی جلوہ ریزیوں سے معمور نظارۂ فضا کر

پہلے شعر کا انداز بیان صحیح نہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ "میری روح تشنۂ ذوقِ معرفت ہے۔ اس کو میکدہ معرفت کا راستہ دکھا" لیکن یہ مفہوم پورے طور پر ادا نہیں ہو سکا۔ کیونکہ تشنۂ ذوق سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ جب تک کہ ذوق معرفت یا ایسا ہی کوئی دوسرا لفظ نہ لایا جائے۔ نیز ذوق کو میکدۂ نشاط سے کوئی تعلق نہیں یا پھر ذوق کے ساتھ کوئی ایسا لفظ آنا چاہئے جس سے نشاط کا تعلق ظاہر ہو۔ دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں نظارہ بیکار ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ "جلوہ ہائے اسرار سے فضا کو معمور کر دے" لیکن اس کو اس طرح کہنا کہ "نظارۂ فضا کو معمور کر دے"

جو رنگ ہے میری زندگی کا لبریز فروغ سادگی ہے
بستانِ شعور و ہوش میرا پروردۂ فیضِ بے خودی ہے

دوسرے شعر میں بے خودی بے محل آیا ہے۔ مقتضائے کلام تو یہ ہے کہ یہاں کسی صفت محمود کا ذکر ہو۔ بے خودی مذموم صفت ہے اور ظاہر ہے کہ بے خودی سے جو چیز پیدا ہوگی وہ مذموم تر ہوگی۔

میرے ظاہر سے نہ کر اندازۂ باطن میرا قلب ہے میرا منور ہے نظر میری حسیں

یہاں دونوں مصرعوں میں تناسب بیان نہیں ہے۔ پہلے مصرعہ میں کہا گیا ہے کہ میرے ظاہر سے میرے باطن کا اندازہ نہ کر، مطلب یہ ہے کہ میں بظاہر بے سر و ساماں سہی۔ لیکن درحقیقت مجھ کو کمال حاصل ہے۔ اس اعتبار سے دوسرے مصرعہ کا پہلا جزو "قلب ہے میرا منور" تو ٹھیک ہے کہ اس سے ایک کیفیت پنہاں کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن پھر یہ کہنا کہ "ہے نظر میری حسیں" صحیح نہیں۔ اس کے بجائے یا تو اپنی ظاہری بے سر و سامانی کا بیان ہونا چاہئے یا پھر کسی خوبی باطنی ہی کو بیان کیا جائے۔ قلب اگر منور ہے تو یہ خوبی باطنی ہوئی۔ اور نظر اگر حسیں ہے (جو بجائے خود محل نظر ہے) تو یہ خوبی ظاہری ہے، کیونکہ قلب کے مقابلہ میں نظر ظاہر سے مناسبت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ قلب کس چیز سے منور ہے۔ اور نہ اس سے پہلے کسی ایسی چیز کا ذکر کیا گیا ہے۔

جس کا ہر جرعہ بڑھا دیتا ہے ذوقِ تشنگی میرے وسعت شوق میں وہ جام تند و تیز ہے
پردۂ فطرت میں پنہاں ہے مرے وہ اک نوا جو سراپا ذوق نامحدود سے لبریز ہے

پہلے شعر میں جام تند و تیز کے بجائے مے تند و تیز ہونا چاہئے۔ دوسرے شعر میں نوا کا مفرد استعمال خلاف فصاحت ہے۔ نوائے شوق۔ نوائے عشق۔ نوائے راز وغیرہ آنا چاہئے۔ پھر سراپا کی بدعت اس پر مزید اضافہ ہے۔ نیز یہ بات بھی تشریح طلب ہے کہ "ذوق نامحدود" سے مراد کس چیز کا ذوق ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ مصرعۂ اول میں اک حسب معمول زاید ہے۔

لے کے آیا ہوں ازل سے وہ دل آتش فشاں جس میں ہیں قندیل بام عرش کے جلوے نہاں
ہوں وہ رند بادہ کش وہ مست صہبائے ازل جس کی مے بے نام اور میخانہ جس کا بے نشاں
گلشنِ فطرت کا ہوں وہ طائر عالی نظر جس کا ہے آغوش طوفانِ حوادث آشیاں

پہلے شعر کے مصرعۂ اول میں کہا گیا ہے کہ "میں ازل سے وہ دل آتش فشاں لے کر آیا ہوں" لہذا دوسرے مصرعہ میں اس دل کی آتش فشانی کا ذکر ہونا چاہئے، لیکن اس کے بجائے اس میں قندیل بام عرش کے جلوے نہاں بتائے گئے ہیں - جو تناسب مضمون سے عاری ہے۔ نیز قندیل بام عرش سے شاعر نے کیا چیز مراد لی ہے یہ سمجھ میں نہیں آیا - اس کے علاوہ بام زاید ہے - صرف قندیل عرش کافی ہے۔

دوسرے شعر کے مصرعۂ اول میں اپنے آپ کو مست صہبائے ازل کہا ہے، لیکن دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں کہ "جس کی مے بے نام ہے" جب اپنے آپ کو مست صہبائے ازل کہہ دیا تو مے بے نام کہاں رہی - اس کے علاوہ مصرعۂ اول کا پہلا جزو "ہوں وہ رند بادہ کش" زاید ہے - بات صرف اتنی ہے کہ "میں وہ مست صہبائے ازل ہوں جس کی مے بے نام ہے"۔

تیسرے شعر میں شاعر نے اپنے آپ کو گلشنِ فطرت کا طائر عالی نظر بتایا ہے، لیکن دوسرے مصرعہ میں عالی نظری کا مظاہرہ اس طرح کیا ہے کہ اپنے آشیانے کو آغوشِ حوادث میں بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ آغوشِ حوادث میں زندگی بسر کرنا اور عالی نظر ہونا دو علٰحدہ باتیں ہیں - پہلے مصرعہ کی عالی نظری کا تو مقتضا یہ تھا کہ دوسرے مصرعہ میں بلند پروازی یا صفت شاہبازی کا ذکر کیا جاتا - طوفانِ حوادث میں زندگی بسر کرنا سخت کوشی یا قوتِ تحمل کا مظاہرہ ہے - اس کو عالی نظری سے کیا تعلق -

ہوں وہ مجروحِ ستم وہ کشتۂ ذوقِ وفا — دیکھ کر جو مسکرا دیتا ہے غم کی بجلیاں
ہوں میں وہ آشفتہ سر وہ بے خود جوشِ طلب — جس کو حاجت راہبر کی ہے نہ ذوقِ آستاں
وہ اسیرِ درد ہوں جس کو نہیں فکرِ خلاص — ہوں میں وہ بے تاب غم جو کر نہیں سکتا فغاں

پہلے شعر کے مصرعہ ثانی میں نہایت بھدی تعقید ہے - دوسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں ذوقِ آستاں صحیح نہیں - اس کے بجائے فکرِ آستاں یا اس کا ہم معنی کوئی مرکب آنا چاہئے - پہلے مصرعہ میں شاعر نے اپنے آپ کو بے خود جوشِ طلب کہا ہے - اگر ذوقِ آستاں نہ ہوتا تو جوشِ طلب کیسے پیدا ہوتا - مطلب یہ ہے کہ میں جوشِ طلب سے اتنا بے خود ہوں کہ مجھ کو پروائے منزل یا فکرِ آستاں نہیں ہے - لیکن ذوق نے اس مفہوم کو اُلٹ دیا - تیسرے شعر میں فکرِ خلاص صحیح ہونے کے باوصف وضاحت سے معرا ہے -

میرے صہبائے محبت میں ہے وہ موجِ شراب — دیکھتا ہوں برق لاہوتی کی جس میں آب و تاب

احسان صاحب نے صہبا اور شراب دو مختلف المعنی لفظ فرض کئے ہیں - حالانکہ یہ دونوں مرادف الفاظ ہیں - پھر صہبا کو مذکر لانا اس سے بھی بڑی ستم ظریفی ہے - اس کے علاوہ مفہوم میں وہی متصوفانہ اہمال موجود ہے -

جس کی ہر موج شرر ہے اک سراپا سیلِ نور — جل رہا ہوں عشق کی اس آتشِ بے دود میں
ہے وہ چشمِ شوق میری جس کو آتا ہے نظر — اک چمن رنگینیوں کا شعلۂ نمرود میں

پہلے شعر میں سراپا زائد ہے - دوسرے شعر میں "شعلۂ نمرود" کے بجائے آتشِ نمرود ہونا چاہئے -

ہوں میں وہ خود رفتۂ و شوریدۂ و فانہ خراب — اک جہانِ حسن ہے بگڑی ہوئی جس کی ادا
ہے فغانِ درد میری وہ خروشِ آرزو — کنگرے دیتا ہے جو عرشِ معلیٰ کے ہلا،

دونوں اشعار میں تعقید کا جو مظاہرہ ہے وہ شاعر کی عدمِ قدرت بیان کا غماز ہے -

بارگاہِ حسن کا ہوں وہ گدائے بے نیاز — جس کے آئینِ جنوں میں ہے تقاضا نا روا
اس تماشا گاہِ ہستی میں ہوں وہ حرماں نصیب — رفعتِ ذوقِ نظر سے ہے جو محروم لقا،

پہلے شعر میں آئینِ جنوں غلط ہے - کیونکہ گدا کا جنوں سے کوئی تعلق نہیں - اس کے بجائے آئینِ طلب یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ آنا چاہئے دوسرے شعر کے محروم لقا میں لقا حشو ہے - مفہوم صرف یہ ہے کہ "میں وہ حرماں نصیب ہوں جو رفعتِ ذوقِ نظر سے محروم ہے"۔ اس کے علاوہ یہ پوری نظم تناسبِ بیان سے عاری ہے - اور جگہ جگہ معنوی تضاد ہے - ان چند اشعار سے ان کی نظم نگاری کا ایک اندازہ کیا

جاسکتا ہے۔ اب میں حصۂ غزلیات سے کچھ شعر پیش کرتا ہوں :

صفحہ ۲۹ - مضراب سوزِ غم سے ذرا چھیڑ سازِ دل — ہر تار میں ہے شعلۂ سینا لئے ہوئے

تعقید کے علاوہ شعر نہایت سست اور قدرتِ بیان سے آزاد ہے :-

صفحہ ۳۰ - پھونکدے اے جمالِ یار خرمنِ آرزو مرا — اپنا مگر دکھا مجھے جلوۂ کیفِ مستقل

جس کا ہر ایک ذرہ ہے رقص گہِ جمالِ قدس — ہے وہی آستاں مرا سجدہ گہِ نیازِ دل

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ تعقید کا شاہکار ہے۔ نیز اس کے جزو اول (اپنا مگر دکھا مجھے) میں پہلوئے ذم چشمک زن ہے۔ دوسرے شعر میں لفظ میرا نہایت غلط طور پر داخل کیا گیا ہے۔ اس کی نثر یوں ہوگی۔ "وہی آستاں سجدہ گہِ نیازِ دل ہے جس کا ہر ایک ذرہ رقص گہِ جمالِ قدس ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں میرا کی کہیں گنجایش نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں اگر "نیازِ دل" کو نکال دیا جائے تو البتہ "میرا سجدہ گہ" آسکتا ہے۔

صفحہ ۳۱- ہے وہ شرارِ معنوی ذرۂ خاک میں مرے — جلوۂ روحِ قدسیاں جس سے ہے پست و منفعل

مصرعۂ ثانی میں جس سے اور پست و منفعل دونوں ٹکڑے غلط ہیں۔ جس سے کے بجائے "جس کے سامنے" صحیح ٹکڑا ہے اور پست و منفعل کے بجائے بے نور یا اس مفہوم کا کوئی دوسرا لفظ۔ مفہوم یہ ہے کہ "میرے ذرۂ خاک میں وہ شرارِ معنوی ہے، جس کے سامنے جلوۂ قدسیاں بے نور نظر آتا ہے۔ جلوۂ روح کو انفعال یا پستی سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کے علاوہ "ذرۂ خاک" بھی روزمرہ کو آنکھیں دکھا رہا ہے

صفحہ ۳۴- کچھ ایسی لذت پنہاں ملی محبت میں، — کہ ہو سکی نہ زباں خوگرِ بکا میری

وہ رندِ خاک نشیں ہوں کہ وقتِ سرمستی — حریمِ قدس ہے ہمراز و ہم نوا میری

پیام دار ہی اب اس کو ذوقِ تسکیں دے — اچھل رہی ہے یہ کب سے رگِ وفا میری

پہلے شعر میں خوگرِ بکا غزل کی زبان نہیں ہے۔ دوسرے شعر میں حریمِ قدس ہے کے بجائے ہوتی ہے کا محل ہے۔ نیز حریمِ قدس کا ہمراز ہونا بھی تکلف سے خالی نہیں ہے۔

تیسرا شعر عجیب ہے۔ یہ میں نے آج ہی پڑھا کہ رگِ وفا کو بھی پیام دار دیا جاتا ہے! علاوہ ازیں پہلے مصرعہ میں ذوق اور دوسرے مصرعہ میں یہ حشو ہیں اور معنوی اعتبار سے یہ دونوں شعر مہمل ہیں۔

صفحہ ۳۵- ہجومِ درد میں کیا مجھکو خوفِ تنہائی — وہ برقِ حسن ہے خود شمع رہ نما میری

دونوں مصرعے دو لخت ہیں۔ برقِ حسن سے رہنمائی کا جو کام لیا گیا ہے وہ یہاں بے محل ہے۔ شمع رہ نما کا ذکر اس وقت صحیح ہو سکتا تھا کہ ظلمتِ شب میں قطع راہ کا تذکرہ ہوتا۔ ہاں اگر مصرعۂ اول میں ہجومِ درد کے بجائے کوئی ایسا لفظ لایا جائے جس سے ظلمت کا مفہوم پیدا ہو سکے تب شمع کا ذکر صحیح ہوگا۔ لیکن شمع رہنما پھر بھی محلِ نظر رہے گا نہایت تعجب کی بات ہے کہ احسان صاحب نے خوفِ تنہائی اور ہجومِ درد کے مقابل شمع رہ نما جیسی غلط اور غیر متناسب چیز کا تذکرہ کیا۔

صفحہ ۴۱- تجھ کو گرنا تھا مرے قلب پہ اے برقِ جمال، — کیا ملا طور پہ تجھ کو شرر افشاں ہو کر

بے اختیار غالب کا مشہور شعر یاد آگیا :

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر، — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

صفحہ ۴۴- وہ دل ہے ننگِ محبت کہ درد میں جس کو — نشاطِ زندگیِ جاوداں نہیں ملتا

نشاط نہیں ملتا کے بجائے نشاط نہیں ملتی زیادہ فصیح ہے۔

؎ راہِ عشق ہے ایثارِ نفس سے درکار — کہ سرِ جبیں کو ترا آستاں نہیں ملتا

ایثارِ نفس اور جبیں میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہر ایک قطرہ ہو جس کا ستارۂ سحری | وہ اشک دیدۂ گوہر فشاں نہیں ملتا

اس شعر کی نثر اس طرح ہوگی۔ "وہ اشک دیدۂ گوہر فشاں نہیں ملتا جس کا ہر قطرہ ستارۂ سحری ہے"۔ اشک دیدۂ گوہر فشاں کا قطرہ، سراسر مہمل بات ہے۔ قطرۂ اشک، یا اشکِ خونیں کا ہر قطرہ، تو مستعمل ہے، لیکن اشک بہ طورِ واحد استعمال کر کے اس سے قطرے پیدا کرنا غلط کاری کے سوا کچھ نہیں۔

صفحہ ۴۵۔ دیکھ رہا ہے حُسن کے جلوۂ بے مثال کو | عشق بھی اک لئے ہوئے لذتِ لازوال کو
لذتِ غم نے اک تری سب کو مٹا کے رکھدیا | شکوۂ دردِ ہجر کو آرزوئے وصال کو

دونوں تعقید کا بری طرح شکار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر کو اتنی بھی قدرتِ کلام حاصل نہیں ہے کہ وہ الفاظ معمولی طور پر ترتیب دے سکے۔

صفحہ ۴۷۔ سیراب جس کے فیض سے ہے روحِ قدسیاں | وہ جام ہے ترے غمِ راحت نواز کا،

دوسرا مصرعہ بہ اعتبارِ اندازِ بیان صحیح نہیں ہے۔ اگر اس کی نثر کی جائے تو صحیح ترتیب یوں ہوگی "ترا غمِ راحت نواز وہ جام ہے جس سے روحِ قدسیاں فیضیاب ہے"۔ غمِ راحت نواز کو جام قرار دینا تکلف سے خالی نہیں ہے۔ ہاں اگر جام کو کسی ترکیب کے ساتھ لایا جائے تو البتہ ایک بات ہو سکتی ہے۔

صفحہ ۴۸۔ یہ عالم شکستگی آشیاں مرا، | اور اس پہ کیفِ رقص تری برق ناز کا

"شکستگی آشیاں" کی ترکیب صحیح نہیں ہے۔ آشیاں شراب کا جام یا عاشق کا دل نہیں جو ٹوٹ جائے۔ وہ اُجڑتا ہے، برباد ہوتا ہے ٹوٹتا نہیں۔ دوسرا مصرعہ تصنع اور آورد کی نہایت بھدی مثال ہے۔

یونہی نہ جانئے مرے اس تارِ اشک کو | اک سلسلہ ہے موج گہر ہائے راز کا

یہاں لفظ موج صحیح نہیں۔ موتی کی آب کے لحاظ سے اس کے لئے موج لا سکتے ہیں لیکن پہلے مصرعہ کے تارِ اشک سے اس کی مناسبت باقی نہیں رہے گی۔

صفحہ ۴۹۔ اک انبساطِ روح کی دُنیا چمک اُٹھی | بھڑکا جو شعلہ تیرے غمِ جانگداز کا
اک سنے میں ورنہ تھیں یہ کہاں شعلہ باریاں | فیض اثر ہے خود یہ لبِ سنے نواز کا

دونوں شعروں میں اک زاید ہے۔ نیز دوسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں فیض اور اثر میں سے بھی ایک لفظ زاید ہے۔

صفحہ ۵۰۔ جس کو اُٹھا کے لے گئی خود رحمتِ ازل | اک سجدہ تھا وہ میرے سرِ بے نیاز کا

رحمتِ ازل کا سجدے کو اُٹھا لے جانا نہایت غیر شاعرانہ اندازِ بیان ہے۔ سجدہ کوئی بیشتہ گراں نہیں ہوتا جس کو اُٹھانے کے لئے رحمتِ ازل، زحمتِ حمالی برداشت کرے۔ نیز اس محل پر "سرِ بے نیاز" کی ترکیب وہی متصوفانہ اہمال کی امین ہے۔

صفحہ ۵۱۔ درِ حرم پہ بیٹھ کر نصیب اہلِ ہوش کو | کہاں وہ سجدہ ریزیاں جبینِ بادہ خوار کی
ہر ایک ذرہ روکشِ جمالِ برق طور ہے | اڑا کے دیکھ اے صبا چمک مرے غبار کی

پہلے شعر میں کرشمۂ تعقید نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے احسان صاحب کی رائے میں جملے کی ترتیب کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ اور شعر میں جو لفظ جہاں چاہیں لا سکتے ہیں۔ اس شعر کی نثر اس طرح ہوگی۔ "اہلِ ہوش کو درِ حرم پہ بیٹھ کر جبینِ بادہ خوار کی سجدہ ریزیاں کہاں نصیب ہو سکتی ہیں"۔ اب شعر میں اس پر جس طرح مشقِ ستم کی گئی ہے وہ داد طلب ہے۔ دوسرے شعر میں صبا کو ذرہ ہائے غبار کی چمک اڑانے کا جو چیلنج دیا گیا ہے وہ بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ صبا کا کام غبار یا ذرہ ہائے غبار اُڑانا ہوتا ہے نہ کہ

درہ ہائے غبار کی چمک -

یہ مجموعۂ کلام دو سو صفحات پر مشتمل ہے - جس میں سے صرف چوتھائی صفحات پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے - اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ باقی حصّے کا کیا حال ہوگا - ایک ادیب و نقاد اور پڑھے لکھے شاعر کا عیوب سے اتنا گراں بار ہونا جتنا حیرت خیز ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے - حرفِ آخر کے طور پر میں آخر میں ان کی ایک پوری غزل نقل کرتا ہوں - اس غزل میں وہ سارے عیوب مجموعی طور پر موجود ہیں جن کا تذکرہ کر چکا ہوں - اور اس سے زیادہ واضح طور پر اسقام و معائب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :-

دیکھ رہا ہے حسن کے جلوۂ بے مثال کو
عشق بھی اک لئے ہوئے لذتِ لازوال کو

وہ مہ و مہر میں کہاں شعلۂ برق میں کہاں
جلوہ دیا ہے تو نے جو قلبِ شکستہ حال کو

میری نگاہِ شوق کی سحر طرازیاں نہ پوچھ
دیتی ہے خود پیامِ کیف جلوہ گہِ جمال کو

جلوۂ لطف خاص کی ہے یہ ادا نگہ شناس
اور کبھی پائمال کر سینۂ پر ملال کو

آئینۂ جمال میں دیکھ رہا ہوں میں ترے
اپنے ہی آب و رنگ کو اپنے ہی وجد و حال کو

لذتِ غم نے اک تری سب کو مٹا کے رکھ دیا
شکوۂ دردِ ہجر کو آرزوئے وصال کو

عشق میں کام آگئی کچھ یہی عجز و خستگی
لے گئی باغِ قدس تک مرغِ شکستہ بال کو

ایک نشاطِ بے حسی ایک سرورِ بے دلی
دیکھ رہا ہوں عشق کے معجزۂ کمال کو

یاد یہ کس کی آگئی برق سی اک چمک گئی
کس نے یہ جگمگا دیا عرصہ گہِ خیال کو

رشید حسن خاں

-: Hindustan Book Agency :-
R-28, Garden Reach Ind. Estate
No..... Date .....

گلہائے جعفری

یعنی

جناب اثر لکھنوی کے ڈیڑھ سو اشعار

جو اڈیٹر نگار نے اپنے تعارفی مقدمہ کے ساتھ بہت اہتمام سے شایع کئے تھے اس کی چند جلدیں اتفاق سے رہ گئی ہیں - آٹھ آنے کے ٹکٹ ملنے پر انتخاب ذریعہ پوسٹ مل سکتا ہے -

فلسفۂ مذہب

مولوی مقبول احمد صاحب کی وہ ہنگامہ خیز تصنیف جس نے علماء اسلام کی "کافر سازی" مجالس میں ہلچل ڈال دی تھی اس میں مذہب کی ابتدا و ضرورت، مذہب، قومیت، قومیت و الٰہیات، مذہب و نبوت، مذہب و تکوین، مذہب و معاد، مذہب و تقریر، مذہب و اخلاق مذہب و عبادات اور انجام مذاہب پر نہایت محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے - قیمت دو روپے -

ملک خطا کے شہزادے

وصی احمد بلگرامی کا وہ مشہور مقالہ جس میں انھوں نے مخصوص اندازِ بیان پر حرمتِ خمر پر مولانا شبلی مرحوم کی تحریر پر اعتراض کیا تھا اور اڈیٹر نگار نے اس پر تبصرہ کیا تھا - قیمت بارہ آنے -

توقیت

"تاریخ اسلامی ہند" کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے یہ توقیت مرتب کی تھی جس میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۷ء تک کے تمام اہم تاریخی واقعات بتقدیم سنہ ہجری یکجا کر دیئے گئے ہیں - تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کار آمد چیز ہے - قیمت ایک روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

فارسی ڈرامے کی بُنیاد

ڈرامہ یا تمثیل اُس نقل کو کہا جاتا ہے، جسے لوگوں کے سامنے پیش کرکے انسانی جذبات، کا اظہار کیا جائے، کبھی اس میں ہمدردی غیرت و جرأت کے واقعات پیش کئے جاتے ہیں، کبھی سوسائٹی کے محاسن و معائب کو مختلف پیرایوں سے دکھایا جاتا ہے اور تمثیل یا ڈرامہ میں ان کا اثر دور رس ہوتا ہے۔

مثل دیگر فنون کے تمثیل کی بھی کئی قسمیں ہیں :-

(۱) المیہ - جس کا انجام تباہی، بربادی و مصیبت ہوتا ہے، اس میں قصہ کا تمام پلاٹ اس طرح کا ہوتا ہے کہ تمام کردار ایک منضبط اخلاقی قوانین کے تحت انتہائی حزن و ملال اور رقت آمیز منظر کو پیش کرتے ہیں۔

(۲) ابتہاجیہ - جس کا انجام خوشی یا مسرت ہوتا ہے، اس میں قصہ کی ابتدا ظلمت و تاریکی سے شروع ہوتی ہے، لیکن بتدریج یاس انگیز حالات مبدل بہ یاس انگیز ہونے لگتے ہیں۔

(۳) تاریخی تمثیل - اس تمثیل کا مواد تاریخی ذرایع سے حاصل کیا جاتا ہے، یہ المیہ یا ابتہاج دونوں قسم کے ہوسکتے ہیں۔

تمثیل ابتہاج کی ذیلی تقسیم بھی کردی گئی ہے :-

(الف) تمسخری (FARCE) اس میں ابتہاج کے مناظر بغیر کسی پلاٹ کے پیش کئے جاتے ہیں۔

(ب) رومان - ایسی تمثیلوں میں محبت کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

(ج) المیہ ابتہاج - ایسی تمثیلوں میں مصائب کے اندوہناک واقعات سحر انگیز طریقے سے ایسا رخ بدلتے ہیں، کہ نازک حالتوں میں پڑکر اچانک مبدل بہ ابتہاج ہوجاتے ہیں۔

(س) تمثیل طنز آمیز - ان میں مصنف افراد یا قوم کے اخلاق و اطوار کو درست کرنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن سے طنز یا ہجو آمیز پیرایہ میں برائیوں کو دور کیا جاسکے۔

تمثیل کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ مغرب سے مستعار ہے، اس دعوے میں کہاں تک صحت و صداقت ہے ہماری بحث سے خارج ہے مشرق میں تو سب سے پہلے ہماری نظر سامی ممالک یعنی عرب، فلسطین اور ایشیائے کوچک پر پڑتی ہے، جہاں تک تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے، اہل عرب نے اپنی تمام صلاحتیں شعر و شاعری پر صرف ہوتی تھیں، لیکن وہ ڈرامہ سے ناآشنا تھے۔ قبل از اسلام، ایران میں بھی ڈرامہ کا وجود نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ ایران کی رنگین سرزمین اس کی نشو و نما کے لئے ہمیشہ موزوں تھی۔

لیکن اسلام اختیار کرنے کے بعد ایرانی تہذیب تمام و کمال اسلامی رنگ میں ڈوب گئی اور جب ایرانی کھنڈروں پر عباسی حکومت قایم ہوئی تو علم و فن کے ہر شعبہ میں ترقی کی راہیں کھل گئیں خلفاء کی سرپرستی نے علم و ہنر کا کوئی گوشہ قبضۂ التفات نہ رکھا۔ اس کے بعد زمانہ کے اوراق اُلٹتے رہے، ہلاکو نے عباسی خاندان کا چراغ گل کیا، طوائف الملوکی پھیلی، تیمور نے کوس لمن الملکی بجایا، اسی ہنگامہ خیز زمانہ میں سعدی بھی پیدا ہوئے اور حافظ بھی مگر کسی نے ڈرامہ یا تمثیل کا اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا۔

مورخوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ بغداد میں امام حسین کی عزاداری، اعلان و اجتماع کے ساتھ معز الدولہ دیلمی کی تحریک سے ۹۶۳ء میں شروع ہوئی، نوحہ و ماتم اور جذبات غم و الم کو نظم سے جو فطری مناسبت ہے اس کی بناء پر یہ امر قرین قیاس ہے کہ ایران

میں مرثیہ گوئی کی بنیاد دیلمیوں کے زمانہ میں پڑی، ماتمیوں کے گروہ سر برہنہ نکلتے تھے، خوب گریہ وزاری کرتے تھے اور سر پہ خاک ڈالتے تھے، ایسا نہ ہوتا تو سوگواروں کے اس گروہ کو یہ سب باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر مصائب ائمہ کی طرف ذہن منتقل نہ ہوتا۔

صفوی بادشاہوں نے اپنے مذہبی عقاید اور سیاسی مصالح کی بنیاد پر آل رسول سے عقیدت اور اُن کے مخالفین سے نفرت کے جذبات کو اُبھارنے اور ترقی دینے کی تدبیریں اختیار کیں، اور اس زمانہ کے شعراء نے مرثیہ گوئی شروع کردی اور مصائب رسول کا ذکر کرنے والے روضہ خواں کہلائے عوام والہانہ عقیدت سے ماتم کرتے تھے، اور جذباتِ غم کا اظہار کرتے تھے، اس میں کسی تمثیل یا نقل وغیرہ کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ قرآن اور احادیث نبوی کے ارشاد کے خلاف کوئی مسلمان تمثیل کی طرف رجوع نہ کرسکتا تھا، اور مسلمان اجتناب کا پہلو اختیار کئے رہے۔

مسلمانوں کے لئے زندہ چیزوں کی تصاویر بنانا منع ہے اس لئے نہ تو رسول صلعم کی تصویر بنائی گئی اور نہ آئمہ کی۔ مسلمان کبھی گوارا نہیں کرسکتے کہ کوئی شخص حضرت محمد صلعم، آئمہ اطہار یا بزرگانِ دین کا پارٹ ادا کرے یا اُن کی نقل اُتارے، یہی وجہ ہے کہ ماہِ محرم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ڈرامہ نہیں کہا جاسکتا، جو کچھ ہوتا ہے والہانہ غم والم کا اظہار ہوتا ہے۔

اٹھارویں صدی میں مغربی طاقتوں کا سیلاب ایشیا والوں کو اپنی بے پناہ گرفت میں لے چکا تھا، مشرق اور مغرب کے تصادم سے ایشیائی سلطنتوں کے قصر وایوان متزلزل تھے، ایسی حالت میں ایران اور ہندوستان پہلی بار مغربی فنون سے واقف ہوئے۔ فن ڈرامہ جو اس وقت یوروپ میں اپنے عروج پر پہونچ چکا تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ اُنیسویں صدی کے اوایل میں ایران اور ہندوستان بہ یک وقت اس سے روشناس ہوئے، ہندوستان میں "جانعالم پیا" واجد علی کو سب سے پہلے اس طرف توجہ ہوئی اور ایران میں ۱۸۲۹ء کے آگ بھگ پہلی بار ایک تمثیل بہجت ( ) "انعام زن" طہران میں ظہور پزیر ہوئی۔

ایران میں جنوبی سمت سے انگریز اپنا اثر جمانے کی فکر میں مصروف تھے تو شمال کی طرف روسیوں کی دست درازی دم نہ لینے دیتی تھی "قفقاز" اور شمالی ترکستان، زار روس کے قلمرو میں شامل ہوگیا، تفلیس میں ۱۸۵۰ء میں ایک تھیٹر قایم ہوا۔ جس میں روسیوں کی تفریح طبع کے لئے روسی زبان میں یورپین ڈرامے کھیلے جاتے تھے، ایرانی جو روسی زبان سے آشنا تھے، جنھوں نے روسی زبان میں جدید تعلیم حاصل کی تھی، اُن میں یہ ڈرامے بہت مقبول ہوئے، اس دلکشی نے اُن کو آمادہ کیا کہ وہ فارسی زبان میں اس صنف ادب کو جگہ دیں۔

مرزا فتح علی اخوند زادہ باشندۂ تفلیس اسی تعلیم یافتہ گروہ کا ایک نوجوان تھا، یہ روس کی رعیت اور روسی حکومت کی ملازمت میں منسلک تھا، جدید تعلیم سے بہرہ ور مغربی ڈرامہ کے فن کا ماہر اور بہت بڑی باکمال شخصیت کا مالک تھا۔

اس ماحول سے مرزا فتح علی اخوند زادہ بہت متاثر ہوا۔ مرزا خود تو تاتاری النسل تھا، اُس کے آباؤ اجداد "قراجہ داغ" میں رہتے تھے، وہ خود یورپین تہذیب کا دلدادہ تھا، اور اپنی حسن کارکردگی کی وجہ سے کپتان کے عہدہ پر فایز تھا، اور اسی وجہ سے اُسے یورپین رسوم وتہذیب کو بہت نزدیک سے مطالعہ کرنے کا عمدہ موقع ہاتھ آیا، اپنی زبان کی کم مایگی پر اُس نے توجہ کی، بالآخر تفلیس میں قیام کرکے آذری ترکی میں "قصہ شاہ یوسف سراج" اور چھ ڈرامے لکھے:

(۱) ملا ابراہیم خلیل کیمیا گر ۱۸۵۰ء (۱۲۶۷ھ) میں
(۲) موسیو ژوردان یا حکیم نباتات ۱۸۵۰ء یا ۱۲۶۷ھ میں
(۳) خرس قولادر بلسان ۱۸۵۱ء - ۱۲۶۸ھ میں
(۴) مرد خسیس ۱۸۵۲ء - ۱۲۶۹ھ میں
(۵) وزیر خاں لنگران ۱۸۵۱ء - ۱۲۶۹ھ میں
(۶) وکلائے مرافعہ ۱۸۵۵ء - ۱۲۷۲ھ میں

مرزا نے ان سب کو یکجائی طور پر شائع کرکے اپنے افسر جنرل ہز ہائنس کے نام پر معنون کیا۔

اسی زمانہ میں کچھ عرصہ پہلے جلال الدین مرزا پسر فتح علی خاں قاچار مرحوم نے نامۂ خسروان ایک کتاب مشتمل بر حالات شاہانِ ایران خاص فارسی میں لکھی جو عربی الفاظ کی آمیزش سے یکسر پاک تھی، اس کی ایک جلد شاہزادہ نے مرزا فتح علی کو بھی بوجہ تناسب علمی بھیجی، اس کے جواب میں مرزا فتح علی نے شاہزادہ کو اپنی تمثیلات کی ایک جلد بھیجدی اس کے ساتھ ایک درخواست بھی لکھ دی کہ اگر اُن کا ترجمہ فارسی میں کردیا جائے تو مناسب ہے، لیکن ایک عرصہ تک یہ کتاب طاقِ نسیاں میں پڑی رہی۔

مرزا جعفر کی پیدائش ۱۸۳۴ء میں شہر قراجہ داغ میں ہوئی، یہ ایک علم دوست، صاحبِ ذوق اہلِ قلم تھا، شہزادہ جلال الدین کے دربار میں اس باکمال کی بڑی قدردانی تھی، اِس کی نظر سے جب مذکورۃ الصدر مجموعہ گزرا تو اُس نے فارسی کا جامہ پہنانا شروع کیا، چنانچہ ۱۸۷۲ء میں ملا ابراہیم خلیل کیمیا گر اور موسیو ژوردان کا فارسی ترجمہ ختم کرلیا لیکن شہزادے کی بروقت موت نے مرزا کو بہت مایوس کردیا۔

مسٹر سڈنی چرچل نے جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۸۶ء میں مرزا کے خود بیان کردہ واقعات شایع کئے ہیں، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اُس کی بیوی مری تو اُس نے ایک لڑکی اپنی نشانی چھوڑی، مرزا اس کو بہت چاہتا تھا جب وہ پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئی تو اُسے فکر دامن گیر ہوئی کہ کوئی ایسا نصاب طیار کیا جائے جس سے صحیح قابلیت پیدا ہو، کیونکہ وہ ایرانی طریقۂ تعلیم کو ناپسند کرتا تھا اسی زمانہ میں شاہزادہ کے کتب خانے میں اُس کی نظر فتح علی کی تمثیلات پر پڑگئی اُس کو پڑھ کر اسے بے انتہا مسرت ہوئی، چنانچہ سب سے پہلے اُس نے ملا ابراہیم خلیل کیمیا گر کا فارسی ترجمہ شاہزادہ کی خدمت میں پیش کیا، شاہزادہ اُس کی خوبیاں دیکھ کر بہت مسرور ہوا اور مترجم کا حوصلہ بڑھایا اور باقی حصّوں کے ترجمہ کی تاکید کی۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء میں موسیو ژوردان کے ترجمہ کی تکمیل ہوئی، ابھی ان ترجموں کے شایع ہونے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ شہزادہ نے رحلت کی اور مرزا کس مپرسی کی حالت میں رہ گیا۔

مرزا کو بہت سی دشواریاں پیش آئیں مگر اُس نے ہمت نہ ہاری اور ترجمہ کے کام کو جاری رکھا اور شایع کرتا رہا۔

۱۸۸۶ء میں فرانسیسی قونصل متعینہ تبریز نے اصلی مصنف (مرزا فتح علی) اور مترجم (مرزا جعفر) کے سوانح حیات کے بارے میں کچھ نوٹ حاصل کئے موسیو باربیر ڈی مینارڈ نے اِن نوٹوں کو اپنے دیباچہ میں درج کیا ہے، اس کا ترجمہ[1] یہاں درج کرتے ہیں:

"مرزا فتح علی ایک دیہاتی مُلّا یا مولوی کا لڑکا تھا یہ قصبہ دہشر کے صوبہ میں بحیرۂ خضر کے قریب تھا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الخ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، طفلس میں مرزا جعفر سے فتح علی کی ملاقات ہوگئی جس نے اتحاد کی شکل اختیار کرلی۔ مرزا جعفر بغرض حج اُس راستہ سے مکہ جارہا تھا، یہاں اُس کی ملاقات چند آزاد پیشہ ایرانی فلسفیوں سے ہوگئی۔ اُن کی صحبت سے متاثر ہوکر اُسنے حج کا ارادہ ترک کردیا، یہاں رہ کر حکومتِ روس کی ملازمت میں منسلک ہوگیا، اور یہیں اُس نے مرزا فتح علی کی تمثیلات کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا، ۱۸۸۳ء میں اُس کا انتقال ہوگیا، دس ہزار تومان (تقریباً چار ہزار روپے) چھوڑے، اس کے ورثاء نے جو ایران میں رہتے تھے تفقّد کا سفر کرکے رقم حاصل کی، اتفاق سے قابل ترک مصنف اصل ۱۸۸۶ء میں زندہ تھا لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُس کے ڈرامے کہیں اسٹیج پر نہیں دکھائے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بہت ہی مزاقیہ ہیں زبان عوامی اور سوقیانہ ہے، اہلِ زبان ایسی زبان کو کب سراہنے والے تھے، دوسری وجہ یہ تھی کہ ان ڈراموں میں درویشوں، مُلّاؤں، نجومیوں، کیمیا گروں کی ہجو اُڑائی گئی تھی حالانکہ عام اہلِ ایران کے دلوں میں اُن کا انتہائی احترام تھا، اس لئے وہ تاب نہ لاسکتے تھے۔"

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مصنف اور مترجم کی سعی بار آور نہ ہوسکتی تھی، ان کتابوں کو محض اصلاح معاشرت کی غرض سے لکھا گیا تھا، مگر اس سے ایک بہت بڑی غرض پوری ہوگئی۔ ایران کے عہدِ حاضرہ کے جدید محاورات و مصطلحات، طرزِ ادا اور زبان کی

---

[1] جرنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۸۶ء

واقفیت حاصل کرنے کے لئے ایک بہترین ذریعہ ہیں، ان سے ترکستان و ایران کے سرحدی قبایل کی معاشرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، غیر اقوام نے ان ڈراموں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور فارسی زبان کے سیکھنے والوں نے بہت فایدہ اُٹھایا - فرانس، انگلستان اور جرمنی میں ان کی اشاعت ہوئی مترادم اور فرہنگیں مرتب ہوئیں -

رغیب حسین

---

(1) The Wazir of Lankran edited with a Translation, Notes & a Vocabulary By. D. Haggard & G. K. Strange. (London, 1882).

(2) Trois Comedis Persanes. Piobliesance Un glossaire et des. des notes sare Barbier de Meynard et. S. Guyard (Paris, 1886)

"نگار" کے پچھلے فایل

سنہ ۳۲ء	= جولائی تا دسمبر =		عـ۱۰ـر
سنہ ۳۶ء	= جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ ہندی شاعری نمبر) =	عـ۲۰ـر
سنہ ۳۷ء	= جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ اصحاب کہف وخلافت نمبر) =	عـ۲۰ـر
سنہ ۳۹ء	= جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ مصحفی نمبر) =	عـ۲۰ـر
سنہ ۴۰ء	= جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ نظیر نمبر) =	عـ۲۰ـر
سنہ ۴۴ء	= جولائی تا دسمبر =		عـ۱۰ـر
سنہ ۴۶ء	= جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ انتقاد نمبر) =	عـ۲۰ـر
سنہ ۴۷ء	= جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ ماجدولین نمبر) =	عـ۲۰ـر
سنہ ۴۹ء	= جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ افسانہ نمبر) =	عـ۲۰ـر
سنہ ۵۰ء	= جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ تنقید نمبر) =	عـ۲۰ـر
سنہ ۵۲ء	= جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ حسرت نمبر) =	عـ۲۰ـر
سنہ ۵۳ء	= جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ داغ نمبر) =	عـ۲۰ـر

(نوٹ) صرف ایک ایک فایل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہونچے گا اُسی کو دیا جائے گا۔ قیمت محصول ڈاک کے علاوہ ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

فضا کی شاعری اور "وطنیت"

سردار جعفری کا خیال ہے کہ "جب ادب عوامی بن جائے گا تو ایسے بے شمار شاعر اور ادیب آئیں گے جو اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہیں گے لیکن "ہیئت" پر انھیں قابو نہ ہوگا۔ انھیں میں سے پھر اچھے شاعر اور ادیب پیدا ہوں گے۔ پتیوں کے بغیر پھول اور پھل نہیں ہو سکتے اچھے شاعر و ادیب چند ہوتے ہیں اور معمولی بہت اس لئے معمولی شاعر و ادیب کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے ورنہ اچھے شاعر و ادیب کبھی پیدا نہ ہوں گے۔"

سردار جعفری نے نئے ادیب و شاعر کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے اس کے "ہیئت" پر قادر نہ ہونے کو معاف کر دیا ہے۔ "اس میں شک نہیں کہ الفاظ شاعر کے مزاج، اس کی تربیت اس کے ماحول اور اس کے مقام کا صحیح پتہ دیتے ہیں، موضوع اور خیالات کی منزل پر پہونچنے کے لئے الفاظ ایک شاہراہ کی طرح ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس راہ میں ہزاروں پیچ و خم اور دشواریاں ہیں۔ کسی بھی ادیب اور شاعر کے لئے اس راہ کو طے کرنا ضروری ہے۔ بعض "قدم اولین" کے بعد ہی گمراہ ہو جاتے ہیں۔ بعض تھوڑی دور چل کر راستے سے پھر آتے ہیں۔ بعض تھک کر بیٹھ جاتے ہیں اور بعض اس ہفت خواں کو طے کر کے اس منزل پر پہونچ جاتے ہیں جہاں خیالات اور موضوعات۔ احساسات اور جذبات زندگی کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے ملتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین"

قاضی عبدالغفار کا خیال ذرا مختلف ہے۔ کہتے ہیں:۔ "یہ تصور ہی غلط ہے کہ کوئی شاعر اپنے وقت سے پہلے یا بعد پیدا ہو سکتا ہے۔ حسن کار ادیب اور شاعر اپنے زمانہ کی اولاد ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے آرٹ میں اپنے وقت کے صحیح نقش و نگار پیش نہ کر سکے تو وہ فن کار یا حسن کار تو ہو سکتا ہے مگر ترجمانِ حقیقت نہیں ہو سکتا۔"

فضا ابن فیضی نہ صرف فنکار اور حسن کار ہے، ترجمانِ حقیقت بھی ہے بلکہ حسن کار کم اور ترجمان حقیقت زیادہ ——— لیکن ہندش الفاظ کے کمالات اور شاعرانہ و فنی خوبیوں سے قطع نظر میں فضا کے جذبات سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اسکی شاعری کی عمر تھوڑی ہے اور اس سے فنی لغزشوں کا سرزد ہونا قرین قیاس بھی ہے ــ فضا ابن فیضی اُردو ادب میں ایک نیا سا نام ضرور ہے۔ لیکن جب ہم اس کے کلام پر نظر کرتے ہیں تو نئی پود کا یہی اُبھرتا ہوا شاعر ایک کہنہ سال ماہر کی طرح زمانہ کی نبضوں کو ٹٹولتا ہوا ملتا ہے۔ آج کل کے نئے شعرا کے لئے پروفیسر رشور نے خوب کہا ہے کہ:۔

عشق کے خط و خال مصنوعی ہجر جھوٹا وصال مصنوعی
حال مصنوعی قال مصنوعی سر سے پا تک جمال مصنوعی

درک اپنا نہ اپنے احساسات
وہی کہنا سنی سنائی بات

یا پھر:

حالِ مزدور پر کہیں رونا کہیں بیوہ کے غم میں جی کھونا
آپ سرمایہ دار سے برہم اور ہمیں کھا گیا کسان کا غم
شاعرِ انقلاب بن بیٹھے
لو فضیلت مآب بن بیٹھے

لیکن فضا نے اپنے لئے ایک نئی راہ متعین کی ہے۔ اور خالص وطنیت کے جذبہ سے اپنی شاعری کا آغاز کر کے اپنے لئے نئی فکر کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اور سابقہ روایات سے منہ موڑ لیا ہے۔ بلکہ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے "گل و بلبل" کے اشاروں کو بھی نہیں اپنایا اور نہ "مشاہدۂ حق کی گفتگو" کے لئے "بادہ و ساغر" کو استعمال کیا ہے۔ بلکہ اپنے وطن میں اس نے جو کچھ شدت سے محسوس کیا خواہ وہ سیاسی واقعات ہوں یا مذہبی اسکو نہایت خلوص کے ساتھ شاعری کے قلب میں سمو دیا ہے۔ اس کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسے نہ عشق و جمال سے سروکار ہے نہ ہجر و وصال سے نہ وہ مزدور پر آنسو بہاتا ہے نہ بیوہ اور کسان کا اسے کوئی غم ہے۔ اسے اپنے وطن کے ہر انسان سے محبت ہے اور وہ اس کے غم کو اپنا غم سمجھتا ہے۔ نئی پود کے بیشتر شاعروں سے اس کے احساسات جداگانہ ہیں وہ انقلاب چاہتا ہے، لیکن اس کی منزل مقصود "اشتراکیت" نہیں ہے بلکہ انسانی اخوت کا وہ عالمگیر دور ہے جہاں ایک انسان دوسرے کا حق غصب نہ کرے اور یہی فضا کی "انفرادیت" ہے۔ فضا کو اپنے وطن سے لگاؤ ہی نہیں بلکہ عشق ہے اور ایک حساس انسان کا اپنے وطن سے محبت کرنا فطری امر ہے۔

"وطنیت" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آج کل کے تمام شعراء کے دل میں جاگزیں ہے لیکن جتنی بھی غزلیں یا نظمیں "وطنیت" کے جذبہ کے تحت کہی جاتی ہیں وہ زیادہ تر تقلیدی ہوتی ہیں۔ اردو ادب میں وطنی ترانوں اور گیتوں کی کمی نہیں لیکن ان میں وطن کے سرسبز میدانات۔ سونا اگلتی ہوئی زمین، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ۔ قابل قدر دریا اور صحت بخش آب و ہوا کے تذکروں اور شاندار ماضی کی داستانوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ "شاعر اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے" اگر کوئی شاعر اپنے دور کی عکاسی نہ کر سکے تو یہی معلوم ہوگا کہ اس کے احساسات اس کے اپنے نہیں ہیں بلکہ جھوٹے ہیں۔ ایک واقعی شاعر کے کلام میں اپنے دور کے تمام خارجی و داخلی اثرات کا موجود ہونا لازمی امر ہے۔ یہی بات ہمیں فضا کے یہاں ملتی ہے اس نے وطن اور "اہل وطن" کو سامنے رکھ کر بہت کچھ کہا ہے۔ اور وطن سے بہت سی امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے:-

میرے افق پر لرز رہی ہیں بہت سی تعمیر نو کی کرنیں
وطن کے مستقبل حسیں کا ستارہ ہوں جگمگا رہا ہوں

لیکن معاملہ صرف "وطن کے مستقبل حسیں" تک ہے۔ ورنہ جب وہ اس خوش آیند خواب سے چونک کر اپنے وطن کا جائزہ لیتا ہے تو اس کا دل غم و غصہ سے بھر جاتا ہے لیکن نیاز فتحپوری کے الفاظ میں "سچا شاعر وہی ہے جو مشاہدات کی تلخیوں سے "نوش جاں" پیدا کرتا ہے۔ فضا کو قنوطیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے بلکہ اس کا ایمان "انقلاب در انقلاب" میں ہے۔ فضا کا نعرۂ انقلاب بھی ملاحظہ فرمائیے جس میں "سرخ سویرے" کی ضرورت کا اعلان نہیں بلکہ موجودہ جمود کو توڑ ڈالنے کا عزم ہے۔

جمود کے شعبدوں کو میں اعتبار کی حد پہ لا رہا ہوں
کہ بعد از انقلاب بھی انقلاب کے گیت گا رہا ہوں

وہ دیکھتا ہے کہ اس کا وطن جو ابھی ابھی ایک غیر معمولی اور اہم ترین انقلاب سے گزرا ہے، ایک بار پھر ایسے حالات کا شکار ہو رہا ہے جو ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ ہیں!

ہیں دماغوں میں وہی ناسور شخصیت ابھی
ہیں کچھ انسانوں میں اوصاف بہیمیت ابھی
سب بدل جانے پہ بھی بدلی نہیں نیت ابھی
چاہئے جمہوریت کی ذمہ داری کا بھی ہوش
لیکن اس خوئے تغافل پر کسے الزام دوں؟

فضا کے حساس دل و دماغ میں اس بات کا علم ہے کہ اس کا وطن ایک عظیم ملک ہے جہاں مختلف فرقے بستے ہیں جن کے مذہبی عقاید

الگ الگ ہیں اور جن کا کلچر تک ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کو محبت اپنے وطن اور وطن کے ہر انسان سے ہے۔ لیکن وہ دیکھ رہا ہے کہ ملک کو غلامی سے تو نجات مل چکی ہے مگر چند لعنتیں اس ملک میں رواج پاتی جا رہی ہیں اور اگر ان کا سدباب نہ ہوا تو اس کا وطن ترقی نہ کر سکے گا۔ اس لئے وہ انقلاب ہی کی دعوت نہیں بلکہ بغاوت کی بھی ترغیب دیتا ہے کہ اس کا ملک ان قابلِ نفرت ذلتوں سے چھٹکارا پا جائے اور "انسان دوستی" کا تقاضا بھی یہی ہے۔

ڈاکٹر سلامت اللہ کے ان الفاظ کو دیکھئے "ہندوستان کے ادب میں "ہندوستان دوستی" کی روایات بہت پرانی ہیں۔ یہاں کلاسیکی ادب میں اور جدید ادب میں بھی انسان دوستی کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ انسان دوستی کا مفہوم ہمیشہ یکساں رہا ہے۔ ہر دور کے سماجی حالات کے مطابق ادب میں انسان دوستی کا مفہوم بدلتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر رامائن اور مہابھارت میں اس کا اظہار کسی راجہ کی انصاف پروری، خدا ترسی اور فیاضی کے ذریعہ ہوتا ہے تو موجودہ زمانہ میں یہ چیز ہمیں پریم چند جیسے ادیبوں کی کہانیوں میں ملتی ہے۔ جہاں وہ زمیندار اور سرمایہ دار طبقہ کے مظالم کی تصویر کھینچتے ہیں۔ اور یہ دکھاتے ہیں کہ کسان اور مزدور کس طرح دکھ بھری زندگی گذار رہے ہیں۔ یا ایک قدم اور آگے بڑھئے تو انسان دوستی کے رنگ روپ میں کچھ اور ہی نکھار آجاتا ہے اور کرشن چندر جیسے مصنفین کے یہاں انسانیت اپنی پوری توانائی کے ساتھ ظلم اور تشدد کے خلاف برسرِ پیکار نظر آتی ہے۔" فضا کی شاعری میں بھی یہ عنصر موجود ہے۔ انسان دوستی کے لئے وہ جن موضوعات سے جنگ کرتا ہوا ملتا ہے ان کا مختصر سا جائزہ ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ "فرقہ پرستی" سیاسی اُلجھاؤ کی پیداوار ہے اور سیاست میں مذہب کے نام پر یہ زہر انسانی ذہنوں میں جگہ پاتا گیا اور وطن کا وہ عظیم ترین "المیہ" ظہور میں آیا جو کتنی ہی بربادیوں اور تباہکاریوں کا باعث ہوا۔ فرقہ پرستی کی بنا پر وطن کے ٹکڑے کر ڈالے گئے۔ لیکن تقسیم سے پہلے اور بعد میں بربریت کے جو ننگے ناچ ہوئے ان کا تصور کر کے ہی ایک حساس انسان کو تلخی اور نفرت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ فرقہ پرستی نے حیوانیت کا روپ دھار کر اس قدر جانی، مالی اور اخلاقی تباہکاریاں مچائی ہیں کہ اس دور کا کوئی انسان مشکل سے بھی اس تلخ ترین حقیقت کو فراموش نہ کر سکے گا۔ بلکہ حسن عسکری کے الفاظ میں "برعظیم ہندوستان کے فسادات ایک پیچیدہ چیز ہیں اور صدیوں کی تاریخ اور صدیوں آگے کے مستقبل سے بُری طرح اُلجھے ہوئے ہیں" اور "آتش و خون" کے اس دور نے فضا کے وطن کو کیا عطا کیا ہے اسی کی زبانی سنئے:۔

جمود زارِ حیاتِ انساں، خموش و ویران جلوہ گاہیں
بھٹکتی آہیں تڑپتے نالے، جھلستی سڑکیں دہکتی راہیں
رگوں میں ڈوبے ہوئے سے نشتر جگر میں چبھتی ہوئی سی آہیں
جبیں کی ہر ایک شکن پہ قایم رُکے ہوئے ولولے جنوں کے
بسے ہوئے تیور دل کے پی میں وہی مقامات کشت و خوں کے
یہ زندگی کا کفن ہے شاید
یہی ہمارا وطن ہے شاید

لیکن آج بھی اس زہر کو انسانی ذہن سے نوچ کر الگ نہیں کیا جا سکا ہے۔ اور وطن کے واقعات اور انسانی کردار میں اس خونچکاں واقعہ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ گو اس دور کو گزرے ہوئے ایک زمانہ نہیں لیکن بہت دن ضرور ہو چکے ہیں۔ انسانی خوئے اخوت کا تقاضا یہی ہے کہ اس المناک واقعہ کو بھلا کر مختلف فرقے شانہ بشانہ ملک کی خوشحالی کے لئے کوشاں ہوں لیکن آج بھی وہی "رقصِ ابلیس" اپنے پورے شباب پر ہے اور آج بھی فرقہ پرستی اپنی بگڑی ہوئی شکل میں نہیں بلکہ اپنے صحیح خط و خال کے ساتھ جلوہ گر ہے اور یہ "جلوہ نمائی" ہی فضا کو خوفزدہ کئے ہوئے ہے کیونکہ فرقہ پرستی کی لعنت وطن کو ترقی کی راہوں سے موڑ کر خانہ جنگی کی حدوں پر لا سکتی ہے۔

کچھ طبیعت میں ہیں خوبیں حوصلے باقی ابھی
ناسزا و ناملائم..... ولولے باقی ابھی
ورنہ کیوں دست و گریباں ہیں بہم ابنائے قوم
لیکن اب اس خانہ جنگی پر کسے الزام دوں؟

شخصیت آہنگ ہے آئینِ جمہوری ابھی
عین مرکز پر بھی مرکز سے ہے دوری ابھی
ہیں مرادف لفظ "آزادی و مجبوری" ابھی
ملک میں فرقہ پرستی کے عناصر ہیں ابھی
لیکن اس فرقہ پرستی پر کسے الزام دوں؟

اسی طرح فضا جا بجا فرقہ پرستی کے خلاف نعرے لگاتا ہوا ملتا ہے۔

تعصب بھی انسانی عظمت کے ماتھے پر کبھی نہ مٹنے والا سیاہ ترین داغ ہے وہ قومیں ترقی نہیں کر سکتیں جہاں تعصب اور جہل اپنی جڑوں کو مضبوطی سے پھیلا چکے ہیں۔ تعصب اور جہل وطن کی خوشحالی کی راہوں کو محدود ہی نہیں کر دیتے بلکہ وطن کی ترقی و عروج کے بھی سخت دشمن ہیں۔ اور جب تعصب کا زہر تجارت۔ مذہب اور سیاست وغیرہ تمام شعبوں میں جاری و ساری رہتا ہے تو ملک ایک عجیب سی کشمکش کی زد میں آجاتا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ :۔

اب بھی جلتے ہیں ضمیروں میں تعصب کے چراغ
اب بھی جہل و ابلہی کے ثبت ہیں چہروں پہ داغ
بادۂ جمہوریت سے اب بھی خالی ہیں ایاغ
بیچتے پھرتے ہیں فرزندِ وطن اپنا ضمیر
لیکن اس قومی تجارت پر کسے الزام دوں

آج بھی ہے اشتراکِ درد کا ربط خموش
اب بھی سینوں میں نہیں حفظِ اقلیت کا جوش
آج بھی موجود ہیں اقوام میں ایماں فروش
آڑ میں ٹٹی کے کھیلا جا رہا ہے یہ شکار
لیکن اس "مکر سیاست" پر کسے الزام دوں

آج جبکہ فرقہ پرستی اور تعصب کی لعنتیں غرور جمہوریت سے انتقام لے رہی ہیں ان لعنتوں کو دور کرنے کی شدید ضرورت ہے اور فضا کے جذبۂ وطنیت کا ان لعنتوں کے خلاف اعلانِ جنگ قابلِ عزت ہے۔

اولین شئے جو ملک کی ترقی و خوشحالی میں ممد و معاون ہے "اقتصادی خوشحالی" ہے، جب ملک مالی حیثیت سے مضبوط ہوتا ہے خود بخود ترقی کی شاہراہوں پہ گامزن ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ ہم ابھی ابھی تقریباً ڈیڑھ سو سالہ غلامی سے آزاد ہوئے ہیں اس لئے ہم اقتصادی خوشحالی سے محروم ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہزاروں انسان "آہ و بھو" کی زندگی کاٹ رہے ہیں۔ اقتصادی گراوٹ ایک دردناک واقعہ ہے انسان اپنا ضمیر ہی نہیں ایمان تک بیچ دیتا ہے اور کتے کی سی زندگی کاٹنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ عصمت فروشی کی لعنت عام ہو جاتی ہے اور گلی گلی "رخسار و دہن" بکنے لگتے ہیں۔ مہلک بیماریاں جنم لیتی ہیں اور زندگی میں بے چینیاں اور کراہیں بھر جاتی ہیں۔

دورِ جدید کی شاعری اس گراوٹ اور سرمایہ پرستی کے خلاف برسرِ پیکار ہے لیکن عہدِ نو کی شاعری کا محرک "سیاسی جذبہ" ہے جو اقتصادی گراوٹ کو سامراجی نظامِ حکومت کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ وطنیت کے جذبہ میں اتنی وسعت، اتنی گہرائی اور اتنا پھیلاؤ ہے کہ تمام سیاسی، مذہبی اور اخلاقی جذبات کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اور یہاں فضا کا نام دیگر ترقی پسند شعراء کے ساتھ لیا جا سکتا ہے کیونکہ فضا ان انسانوں کو بھی "انقلاب" کے لئے اُکساتا ہے جو اس گراوٹ کا شکار ہیں۔ اس کا وطن ایسے انسانوں سے بھرا پڑا ہے:-

نظر پریشاں اُداس چہرے — پھٹے ہوئے چیتھڑے بدن پر
جبیں کے ہر موڑ پر تباہی — قدم قدم ایک تازہ ٹھوکر
جھکے سے تیور زبان سوکھی — کمر پہ ہاتھ اور شکم پہ پتھر
ہے بات کرنا بھی جس کو مشکل — ہے سانس لینا بھی جس کو دوبھر

نہ جانے کس طرح جی رہے ہیں تڑپ تڑپ کر یہ جینے والے
خود اپنی سوکھی ہوئی رگوں کا لہو زمانے میں پینے والے
ایک اقتصادی چبھن ہے شاید
یہی ہمارا وطن ہے شاید

وطن پرستی اور انسان دوستی کے جذبات اس بات کے مقتضی ہیں کہ وطن میں ان لعنتوں کو اپنے لئے جگہ نہ پیدا کرنے دی جائے ورنہ ملک خوشحال نہ بن سکے گا۔ ع

رہیں یونہی محوِ خواب ہم تو سکوں میسر نہ آسکے گا
کہ اور ملکوں کے "ہند اپنا" کبھی برابر نہ ہو سکے گا

کیونکہ انھیں قابلِ نفرت جھمیلوں میں اُلجھ کر ملک اپنا قومی مفاد کھو رہا ہے طبیعتیں اُچاٹ ہوتی جا رہی ہیں۔

انانیت کی حدوں سے باہر — جہالتِ علم و فن کا پیکر
طبیعتوں سے کھو چکا ہے — نفاستوں کا لطیف جوہر
جو توڑ دیتا ہے زندگی کی — حقیقتوں کا بلوریں ساغر

طلسم سا بن رہا ہے کوئی فضا پہ اک گرد چھا رہی ہے
نئی اُمنگیں کہاں ہوں پیدا شباب کو نیند آ رہی ہے

فضا کو اپنے وطن کے لئے کس قدر "تشویش" ہے غالباً اس کا اندازہ ہو چکا ہوگا۔ وطنیت کا یہ "خالص جذبہ" بہت کم شاعروں کے یہاں کارفرما ہے۔ فضا کو چونکہ اپنے وطن سے بے پناہ محبت ہے وہ ان زہریلے عناصر کو مزید پھیلنے پھولنے کا موقع نہیں دے سکتا جو "امن دشمن" اور "غیر جمہوری" ہیں وطن کی خوشحالی کا راز اسی میں ہے کہ انسانیت پسندی اپنی پوری قوت و توانائی کے ساتھ ظلم و تشدد کے خلاف "میدانِ جنگ" میں آجائے فضا "اجتماعی جد و جہد" پر ایمان رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ علمِ بغاوت لیکر اپنے وطن کی سلامتی اور خوشحالی کے لئے وطن کے سپوت "امن دشمن عناصر اور مکر سیاست" کے قلعوں پر ہلہ بول دیں۔

بغیر سچ کے مفر نہیں ہے — جو سچ کہے تو زباں کٹے اب
وطن کی افسردہ محفلوں میں — کنول تمدن کے جل چکے اب
یہ عافیت طلب نہ ہو سکیں گے — سیاستوں کے یہ مرحلے اب

شفق کے ماتھے سے خون ٹپکا نیا عذاب آ رہا ہے کوئی
بہت خطرناک دردانگیز انقلاب آ رہا ہے کوئی

اور وہ اس انقلاب کے نتیجہ سے پوری طرح مطمئن بھی ہے۔ ان ظلمتوں سے جنگ کر کے اسے کیا حاصل ہونے والا ہے اس کی بھی پیشین گوئی کرتا ہے:

ہر ایک ذرہ سے خاک کے جگمگاتے سورج اُبھر سکیں گے
میں عصر حاضر کی ظلمتوں میں کچھ ایسے جلوے دکھا رہا ہوں

یہی نہیں بلکہ وہ اپنے وطن کے ہر نوجوان کو "انقلاب نو" کے لئے آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ اب ہم آزاد ہو چکے ہیں ہم نے فکر غلامی کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے ایک بار پھر ہمیں اسی ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کرنا ہے:

نیا کوئی گیت شش جہت کی خموشیوں میں بکھیرتا اُٹھ
اُٹھ اس طرح انقلاب در بر رخ زمانہ کا موڑتا اُٹھ

وہ شعبدے ہو چکے ہیں باطل جنون ہوشیار ہو چکا ہے
جہاں کا نقشہ بدل چکا ہے زمانہ بیدار ہو چکا ہے

اور وطن کی اسی آزاد سرزمین پر اس کے عزم اور بلند حوصلے پروان چڑھتے جا رہے ہیں وہ اس دور ناروا میں جہاں ظالموں کے لئے آگ برسانا چاہتا ہے وہیں مظلوموں کے لئے رحمت بن جانے کا بھی اشتیاق رکھتا ہے۔ وہ اپنے وطن کو خوش سے خوشتر دیکھنا چاہتا ہے ذرا اس کے عزائم ملاحظہ فرمائیے:

یہ وسعتیں کچھ نہیں ہیں کونین آزما حوصلوں کے آگے،
میں دھوپ بنکر جو پھیلتا ہوں غبار بنکر بھی چھا رہا ہوں

بلند آہنگ ہمتیں ہوں تو حادثاتِ زمانہ کیا ہیں
لرز رہے ہیں جہاں پہ شعلے وہیں کھڑا مسکرا رہا ہوں

فضا میں اک شمع انقلاب وطن کبھی جل اُٹھی تھی جس سے
میں اپنے شعلوں کے ساز پر وہ رجز ابھی گنگنا رہا ہوں

غضب غضب زندگی کی راہوں میں اس طرح تم بھٹک رہے ہو
میں موت کی وادیوں میں بھی زندگی کو رستہ بتا رہا ہوں

اس مختصر سے جائزہ میں معلوم ہو جاتا ہے کہ "وطنی ترانے" لکھنے والوں کے جذبۂ وطنیت میں اور فضا کی وطنیت میں کتنا فرق ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے شاعروں کے یہاں جذبۂ وطنیت بالکل مفقود ہے اور نہ مجھے ان کے اس جذبہ کے خلوص پر شبہ ہے۔ فضا کے یہاں جو جذبہ کارفرما ہے وہ منفرد ہے وہ "وطن پرست" شاعر ہے اس کے احساسات زندہ ہیں، اور وطن کی صورتِ حال کا صحیح جائزہ لے کر اس کے متعلق اپنے جذبات کا بے باکانہ اظہار کرتا ہے۔ وطن کے لئے تعمیری جذبہ ایک مبارک جذبہ ہے اور وطن کی تخریب پسند سرگرمیوں کو ختم کرنے کا عزم قابلِ احترام ہے اور یہی وجہ ہے کہ فضا کی شاعری میں وطنیت کا جو "شعلۂ جوالہ" ہے وہ دیگر نوجوان وطن پرست شعراء کے لئے "مشعل راہ" کی حیثیت رکھتا ہے ع

میرے افق پہ لرز رہی ہیں بہت سی تعمیر نو کی کرنیں
وطن کے مستقبل حسیں کا ستارہ ہوں جگمگا رہا ہوں

نور مظفر

یادِ رفتگاں

اختر شیرانی اور سلمائے گجرات

(۲۸ء کا ایک صحیفۂ محبت)

اختر شیرانی

سلمائے گجرات سے

"دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو"

تمھیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے!
شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے!

کبھی، چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے
نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے!

روپہلی چاندنی نے رات کو کھلی چھت پر
ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے!

بہار صبح کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے!
نسیم نے تمھیں، مستانہ وار دیکھا ہے!

سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے!

قریبِ شام، تمھیں طائرانِ گلشن نے
ہزار بار، سرِ لالہ زار دیکھا ہے!!

بہشتِ حسن کی ننھی کلی کے دھوکے میں!
سحر نے بھی تمھیں دیوانہ وار دیکھا ہے!

سنہرے پانی میں، چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے!

ہمیشہ رات کو، محوِ مطالعہ تم کو!
نگاہِ شمع نے پروانہ وار دیکھا ہے!

کبھی جو اُٹھی ہو گیسو سنوارنے کے لئے
تو آئینے نے تمھیں ہمکنار دیکھا ہے!

گھٹا نے دامنِ کہسار میں تمھیں اکثر
اسیرِ زمزمۂ آبشار، دیکھا ہے!

عروسِ برق نے اپنا نقاب اُلٹ کے تمھیں
غرقِ مستیِ ابرِ بہار، دیکھا ہے!

کسی خیال میں کھوئے تمھیں اکثر،
نگاہِ گل نے تہ شاخسار، دیکھا ہے!

نسیم باغ نے زیب النسا سمجھ کے کبھی
تمھیں بہ گلکدۂ شالامار دیکھا ہے!

غرض - مظاہرِ فطرت نے ہر طرح تم کو!
ہزار بار، نہیں! لاکھ بار دیکھا ہے!

مگر، مری نگہِ شوق کو شکایت ہے!
کہ اُس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے!!!

دکھا دو! ایک جھلک، اور ــــ بس نگاہوں کو!!!

"دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس" نگاہوں کو!!!

-: READING ROOM :-
-: Hindustani Library :-
R-28, Garden Reach Rd. Cal-24
No.....Da.....

سلمائے گجرات

"اخترؔ شیرانی سے"

کوئی کیوں دیکھے ؟

کسی کی عرض ہوس آشکار کیوں دیکھے ؟ غریب، بھول کے کوئی "نگار" کیوں دیکھے ؟
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو کوئی یہ سرخیِ افسانہ کار کیوں دیکھے ؟
ہمیں ستاروں نے دیکھا، یونہی سہی لیکن کوئی نگاہِ ہوس آشکار کیوں دیکھے ؟
ہمارا آئینہ کیوں ، ہم سے ہمکنار نہ ہو؟ خدا نہ کردہ، تمھیں ہمکنار، کیوں دیکھے ؟
ہیں پردہ دارِ سراپردہ ہائے عفت ہم! شفق بھی ہم کو سرِ جوئبار کیوں دیکھے ؟
چلو، وہ چاند نے دیکھا ہے یا نہیں دیکھا ؟ کسی کا دیدۂ گستاخ وار کیوں دیکھے ؟
کبھی نہ جائیں گے اب سے چمن میں بھول کے ہم نگاہِ گل ، ہمیں آئینہ وار کیوں دیکھے ؟
وہ پہلی چاندنی اور اُس کی اس قدر جرأت ؟ وہ ہم کو سوتے ہوئے بار بار کیوں دیکھے ؟
حیا سے دیکھتے ہی پانی پانی ہو جائیں ہمیں گھٹا بھی سرِ آبشار کیوں دیکھے ؟
عروسِ برق ہے ہمجنس ، پر نہیں منظور وہ غرقِ مستیِ ابرِ بہار کیوں دیکھے ؟
قسم ہے آج سے گر بام پر چڑھیں ، سورج ہمارے گیسوئے مشکیں بہار کیوں دیکھے ؟
نہیں ، کہ غیر ہے لیکن ہمارے جلووں کو نگاہِ گل بھی تہ شاخسار کیوں دیکھے ؟
بُری نظر سے جو دیکھے تو آنکھیں ہی پھوٹیں؟ بھلا کوئی ہمیں مشتاق وار کیوں دیکھے ؟
یہ جُرم کم ہے کہ "اِک بار" ہم کو دیکھ لیا! کوئی "شریرؔ" ہمیں "بار بار" کیوں دیکھے ؟

ٹٹاؤ یوں نہ کہیں بے سبب نگاہوں کو !
قلم کو ضبط سکھاؤ ! ادب نگاہوں کو !

-: READING ROOM :-
-: Hindustani Library :-
R-28, Garden Reach Rd. Cal—24
No..... Date.....

شفا گوالیاری

اس دوران میں دو بار بھوپال جانا ہوا اور منجملہ اور بہت سی ترقیوں کے (جن کا ذکر آیندہ کسی وقت تفصیل کے ساتھ کروں گا) وہاں کے نوجوانوں میں ذہنی و ادبی ترقی کے بھی آثار میں نے پائے۔ چونکہ بھوپال سے مجھے بہت گہرا تعلق ہے، اس لئے قدرتاً میرا جی چاہا کہ یہاں کے نوجوانوں میں علم و ادب کی خدمت کی جو اُمنگ پیدا ہوئی ہے اس کو اُبھارا جائے اور یہاں کے شاعروں اور ادیبوں کو جو اپنے اندر ترقی کی اہلیت رکھتے ہیں، ملک سے روشناس کرایا جائے۔ اس وقت میرے عہد کے تین مشہور ادیب و شاعر یہاں موجود ہیں، حضرت محوی لکھنوی۔ جناب کوثر چاندپوری۔ حضرت حامد بھوپالی اور میں چاہتا تھا کہ وہی اس خدمت کو انجام دیں۔ خوشی کی بات ہے کہ جناب کوثر چاندپوری نے بھوپال کے ایک نوجوان شاعر شفا گوالیاری کا تعارف کرکے اس کی ابتدا کی ہے۔ امید ہے کہ مولانا محوی اور جناب حامد بھی اپنے وطن کے نوجوان ادیبوں کو سامنے لانے کی سعی فرمائیں گے۔ نیاز

غزل شاعری کی ایک ایسی مقبول اور روح میں تیر جانے والی صنف ہے جو شدید مخالفتوں کے باوجود زندہ ہے اور غالباً ہمیشہ زندہ رہیگی اس کی پائدار زندگی کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ اس میں عشق و محبت کے اُن جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے جو انسان کی فطرت بن چکے ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کے تمام مسایل پر چھا جانے کی صلاحیت بھی اس میں پائی جاتی ہے۔

حیاتِ انسانی میں بڑا تنوع ہے، وہ ایک سمندر کی حیثیت رکھتی ہے جس میں ہر لمحہ نئی نئی لہریں اُٹھتی ہیں، جس کی سطح پر ان گنت حباب پنپتے ہیں اور تہ میں لاتعداد موتی جنم لیتے رہتے ہیں، اس میں ڈبو دینے کی قوت بھی ہے اور اُبھار دینے کی صلاحیت بھی، اس میں موت کے بھنور بھی ناچتے ہیں اور زندگی کے مدوجزر بھی پیدا ہوتے ہیں، اور غزل زندگی کی انھیں بے شمار کیفیات کے اظہار کا ذریعہ ہے، جس میں سماجی و معاشی احساس کی دھڑکنیں بھی ہوتی ہیں، خوشی کے قہقہے بھی اور غم کے آنسو بھی، یہاں تک کہ تاریخ، تصوف، فلسفہ اور اخلاق کی گنجائش بھی اس میں نکل آتی ہے۔

شفا گوالیاری کو میں اس دور کے ایسے ہی غزل گو شاعروں میں شمار کرتا ہوں جو غزل کے مزاج میں ان تمام عناصر کو توازن و تناسب کے ساتھ شامل رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اگرچہ شفا کا علمی پس منظر زیادہ وسیع نہیں ہے، اُن کے مطالعہ میں بھی زیادہ گہرائی نہیں ہے، اُنکی غزلوں کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے لیکن انکا شعور، زندگی کی کھلی ہوئی فضاؤں میں پھیل جانے کی تڑپ اپنے اندر ضرور رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں وہ طاقتِ پرواز نہ ہو جو پوری کامیابی کے ساتھ ان پہنائیوں کو ناپ سکے۔

شفا فطری طور پر وہ صلاحیتیں رکھتے ہیں جو ایک غزل گو شاعر میں ہونی چاہئیں۔ ان میں ایک نوع کی گھبراہٹ سی پائی جاتی ہے جو ان کی ہر ادا سے نمایاں ہے اور غالباً نتیجہ ہے شدتِ احساس اور فطری الم پذیری کا۔

شفا کے لہجے اور پڑھنے کے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ اگر انھیں دورِ حاضر کے سماجی اور معاشی مسایل کی تلخی سہارا نہ دیتی تو وہ صرف مرثیے کہتے، اور اس طرح اپنے فطری سوز کی چنگاریوں کو اپنے ہی آنسوؤں سے بجھا لیتے، شفا عرصہ تک پرانے ڈگر پر چلتے رہے ہیں، اُس وقت کے کلام

میں تصوف کے روایتی مسایل ہیں اسی قسم کی اصطلاحات کا التزام ہے، تجنیس لفظی ہے اور الفاظ کے مناسب الفاظ لانے کی ایک مسلسل کوشش۔ لیکن آگے چل کر ان کا رنگ بدلا وقت کے تقاضے ان کے کانوں میں گونجے اور زندگی کی ضروریات پر نگاہیں پڑیں اور ان کا شاعرانہ رجحان بھی بدلا۔ اگرچہ حسن و عشق غزل کا بنیادی موضوع ہے لیکن جو لوگ اس مادی دنیا میں جی رہے ہیں جہاں قدم قدم پر مصیبتیں ہیں اور ان کے ساتھ افلاس و غربت کی وہ مشکلات ہیں جو اعصاب سے عشق و محبت کی ساری رنگینیاں نچوڑ لیتی ہیں اور رگوں میں دوڑتے ہوئے ولولوں کو منجمد کر دیتی ہیں، اسی لئے وہ جانتے ہیں کہ غم حیات بہت بڑی چیز ہے۔ اس کا شعور بڑی بڑی شاہراہوں پر دوڑنے کا عزم پیدا کر دیتا ہے۔ اس خیال کو وہ اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

انھیں کو زندہ کہلانے کا حق ہوتا ہے دنیا میں جو مرنے پر بھی اپنی زندگی کی بات رکھتے ہیں

انسان زندگی کا مظہر اتم ہے وہ ایک ایسا جوہر ہے جو اپنی ذاتی کوششوں کے سہارے ہی قایم ہے، وہ تیرگی میں روشنی بن کر چمکتا ہے اور جب کائنات پر اندھیروں کی چادریں تن جاتی ہیں تو وہی انھیں چاک کر کے سورج کی روشنی لاتا ہے لیکن جب اس کے دل سے اس عظمت کا احساس فنا ہو جاتا ہے، خودی کی چنگاری بجھ جاتی ہے تو اس کی ساری عظمتیں سرنگوں ہو جاتی ہیں اور اس وقت شاعر احساس کو جھنجھوڑ کر اس میں خودی کا شعلہ فروزاں کر دیتا ہے، شفا ایک ایسے ہی نازک مقام پر لطیف طنزیہ انداز میں اس سے سوال کرتے ہیں ؎

کیا ہوئی تیری نگاہِ مہر ساز کیوں افق سے مانگتا ہے تو سحر

انسان اپنی عظیم صلاحیتوں سے واقف نہیں ہوتا تو روشنی کی کرنیں اپنے وجود کے باہر ڈھونڈنے لگتا ہے اور زندگی کے تاریک راستوں میں اُجالا پھیلانے کے لئے چاند، سورج سے تنویریں مانگنے لگتا ہے۔ شفا اس التجا کو توہین انسانیت سمجھتے ہیں وہ انسان کے اندر ایسی مستقل روشنی دیکھتے ہیں جو ہر اندھیرے کو روشن کر سکتی ہے ؎

چاند سورج کا نہ انساں بھی بنا کر رہے اپنی راہوں میں خود اپنی روشنی بن کر رہے

جو لوگ اپنی عظمت کو نہیں سمجھتے ان کی دنیا میں صبح کی تخلیق چاند سورج پر ہی منحصر ہوتی ہے ان کی ذاتی کوششوں کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ؎

آج تک ہم نے فروغِ دل پہ نظریں ہی نہ کیں مہر و مہ پر منحصر اپنی سحر سمجھا کئے

فراق گورکھپوری کہتے ہیں کہ ادب اسی وقت زندہ رہ سکتا ہے اور ترقی کر سکتا ہے جب وہ جمہور کی ترقی میں مددگار ہو۔ ایمرسن کہتا ہے کہ ہر دور کو اپنا قومی ادب ( ) پیدا کرنا چاہئے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ادبی فن پارے عصری رجحانات کا ہونا ضروری ہے اور شاعر اور ادیب کا سب سے بڑا ترقی پسندانہ اقدام یہی ہے کہ وہ اس راز کو سمجھ لے اور وقت کے تقاضوں سے چشم پوشی نہ کرے۔

شفا اس بات کو جانتے ہیں اور غم دوراں کو خوشی کا ایک پیام سمجھتے ہیں ؎

اے غمِ عالم تری اس دلنوازی کے نثار تیرے نزدیک آ کے جیسے ہر خوشی تک آ گئے

زندگی میں ہر لمحہ مسابقت جاری رہتی ہے اور جب اس میں کوئی ہار جاتا ہے تو اس کا ولولۂ عمل ٹھنڈا نہیں ہوتا بلکہ اور بھڑک اٹھتا ہے۔ حوصلہ مند کبھی شکستوں سے ڈرا نہیں کرتے۔ ہار کا خطرہ انھیں کو ہوتا ہے جن کے دلوں میں زندگی، عزم اور حوصلہ کی آگ بجھ چکی ہے زندہ اور عملی آدمی کے حوصلے شکست کی چوٹ کھا کر ہی بڑھتے ہیں ہار سے ڈرنے والے فتح کی مسرت سے محروم رہ جاتے ہیں ؎

جہاں زندگی کو شکستوں کا ڈر ہے وہیں زندگی کو سہارے ملیں گے

اس شعر میں زندگی کی تکرار سے کافی لطف پیدا ہو گیا ہے اور یقین کی قوت بڑھ گئی ہے۔

شفا کا تغزل کافی نکھرا ستھرا اور پاکیزہ ہے، وہ حسن و عشق کی بات کرتے وقت بہکتے نہیں اور ان حدود میں داخل نہیں ہوتے جو متانت اور سنجیدگی کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ صوفیانہ اور عامیانہ انداز بیان سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ رندی اور سرمستی کے جذبات سے

بھی گریز کی کوشش کرتے ہیں۔ تغزل اُن کے یہاں ہے ضرور مگر اس حد تک نہیں ہے کہ زندگی کے دوسرے مسایل کا احساس باقی نہ رہے وہ غزل میں مٹھاس اور ترنم پیدا کرنے کے لئے ہی عام طور پر اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے چند اشعار دیکھئے ؎

شبِ فراق کچھ ایسے بھی حادثے گزرے۔ چراغ جلتے رہے اور روشنی نہ رہی

مرے ذوقِ تجسس کی وہ منزل کونسی ہوگی نظر جب اُن کو پاکر بھی انھیں کو ڈھونڈھتی ہوگی

خرد کی راہ سے دیوانگی تک بات کیوں پہونچے شعورِ غم کی آشفتہ سری تک بات کیوں پہونچے

کدھر ہے غیرتِ غم کچھ مجھے سہارا دے وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں "تری خوشی کیا ہے"

حقیقت کو زیادہ چھاننے سے حقیقت بھی نہ بن جائے فسانہ

اب اور کون سے گل رہ گئے ہیں کھلنے کو الٰہی خیر ہو کیوں مسکرائے دیوانے

خودیٔ حسن تھی یا بیخودیٔ عشق تھی یہ کہ عمر بھر وہ ہمیں - ہم انھیں نہ پہچانے

ہوا چمن میں پھر اعلانِ آشیاں بندی ابھی کی بات ہے اک امتحاں سے گزرے ہیں

کچھ اس ترکیب سے اب آشیاں برباد ہوتے ہیں کہ بربادی کا خود اپنے ہی سر الزام آتا ہے

شگفتِ[1] گل کا کچھ شبنم پہ بھی الزام آتا ہے کہاں کی یاد کس کا ذکر ان کی بزم رنگیں میں

اب تک نگاہ میں ہے پہلی نگاہ اُن کی ہستی رہی محبت لٹتا رہا زمانہ

کوئی غم ہو شفا فطرت کا اِک انعام ہوتا ہے کہ اس سے زندگی کے سارے امکاں جاگ اُٹھتے ہیں

چھپائی حسن سے بھی عشق کی آشفتگی میں نے نظر جب اُن کی اُٹھی تو نظر خود پھیر لی میں نے

اُس کو ہی مسکرانے کا حق ہے حقیقتاً آنکھوں میں جس کی اشک ہوں اور مسکراسکے

جو کر دیتی ہے ساری عمر کی تاریخ کو روشن حیاتِ مختصر میں اک گھڑی ایسی بھی ہوتی ہے

مسلّم ذوقِ آزادی بھی، آدابِ اسیری بھی قفس تک اُڑ کے خاکِ آشیاں آئی تو کیا ہوگا

کوثر چاندپوری

[1] شگفت = معنی شگفتگی صحیح نہیں ہے۔ شگفت کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ (نیاز)

نگار کی ایجنسی حاصل کرنے کے قواعد

۱- نگار کے معمولی پرچوں کی قیمت ۱۰ ارفی پرچہ ہے - ایجنٹوں سے ۷ ارلئے جاتے ہیں، لیکن مصارف رجسٹری بھی انھیں کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲- پانچ پرچوں سے کم کے لئے ایجنسی قایم نہیں کی جاتی - اور ایجنٹوں کو ۵ پرچے ذریعہ وی پی پر میں روانہ کئے جاتے ہیں - غیر فروخت شدہ پرچے واپس نہیں لئے جاتے۔

۳- سالناموں کی قیمت ہر سال مختلف ہوتی ہے۔ جس میں ایجنٹوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن دیا جاتا ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

فنِ تحریر کی تاریخ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

البانوی رسم خط (ALBANIAN.ALPHABET)

۱۹۰۸ء میں البانیہ میں سرکاری طور پر لاطینی خط بعض تبدیلیوں کے بعد اختیار کر لیا گیا۔ اس سے پہلے قدرے ترمیم شدہ یونانی خط مستعمل تھا جس کی تین قسمیں تھیں :-

(۱) ایلباسن خط (ELBASAN) ___ جس میں ۵۲ حروف کام آتے تھے یہ ایلباسن (جنوبی البانیہ) اور اُس کے جنوب یعنی بیرآٹ میں مروج تھا۔

(۲) بُوتھا کوکائی خط (BUHTHAKUKYE) جسے اِسی نام کے شخص نے گزشتہ صدی کے وسط میں ایجاد کیا تھا۔

(۳) آرگی روکاسٹرن خط (ARGYROKASTRON) جو اسی نام کے مقام پر جنوبی البانیہ میں مروج تھا۔ اس میں ۲۲ حروف کام آتے تھے۔ البانیہ کے ایک امیرزادہ مسمّی ویسوبے (VESO.BEY) نے جو علیسوت پاشا (ALISOT.PASHA) کے خاندان سے تھا اس خط کے وجود سے آسٹریا کے قونصل فان ہان (VON.HAHN) کو ۱۸۵۰ء میں مطلع کیا تھا۔ دراصل مسٹر ہان کو البانوی زبان اور رسم خط سے بڑی دلچسپی تھی اور انھیں کی بدولت ہمیں مذکورۂ بالا خطوں کا علم حاصل ہوا ہے۔

یہ تینوں خط چھوٹے یونانی حروف کی گھسیٹ شکلوں پر مبنی تھے جن میں کافی حذف و اضافہ کیا گیا تھا، دو یا تین حروف کو بطور ایک جوڑ کے ملا کر بھی نئے حروف (LIGATURES) وضع کئے گئے تھے۔ ڈاکٹر ڈیوڈ ڈرینگر کی رائے میں ان کا تعلق مرموز نویسی سے تھا۔ ترکی افسران کی مداخلت سے بچنے کے لئے باہمی نامہ و پیام کے واسطے البانوی آبادی نے انھیں ایجاد کیا تھا۔

البانوی رسوم خط صرف مقامی اہمیت کے حامل تھے۔ ان کی قدیم صورتوں کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ان کے حروف کا جن میں سے بعض مرکب ہیں) یونانی حروف سے تعلق صحیح طور پر نہیں قایم کیا جا سکتا۔ اس لئے نقشہ نمبر ۲۷ کو جو آئزک ٹیلر کی کتاب سے ماخوذ ہے محض آزمائشی یا تجرباتی (TENTATIVE) سمجھنا چاہئے۔

رونی رسم خط (RUNIC.SCRIPT)

وجہ تسمیہ : قدیم نارڈک زبان کے لفظ رون، آئس لینڈ کے روٹر اور قدیم جرمن زبان کے لفظ روٹا کے معنی "راز" یا "بھید" کے تھے چونکہ اس خط کے حروف طلسمی صفات کے حامل مانے جاتے تھے اور انھیں لکھنے پڑھنے کے علاوہ جادو ٹونے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا لہٰذا ان کو (RUNES) کہنے لگے ___ نیچے رونی خط کی مختلف اقسام کا علٰحدہ علٰحدہ ذکر کیا جاتا ہے :-

(۱) ابتدائی ٹیوٹانی یا گوتھک رونی خط اس کے تقریباً ۱۰۰ کتبے موجود ہیں جو بیشتر تیسری سے آٹھویں صدی عیسوی تک کے ہیں۔ یہ خط ۲۴ حروف پر مشتمل تھا جو آٹھ آٹھ کے تین مجموعوں میں منقسم تھے ہر مجموعہ کو (CETT) کہتے تھے اس لفظ کے معنی "آٹھ" کے ہیں۔ پہلے چھ حروف کی رعایت سے یہ خط (FUTHORC) کہلاتا تھا یونانی حروف کی طرح ہر رونی حرف کا ایک نام تھا اور سامی حروف کی طرح ان کے معنی تھے۔ یہ نام اینگلو سیکسن مسودوں میں محفوظ ہیں۔ (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۲۸) بظاہر نام کی شکلوں اور معنی میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

پہلے یہ خط دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا تھا لیکن بعد میں بائیں طرف سے لکھنے لگے۔ کتابت کی سخت سطحوں (لکڑی، دھات اور پتھر) نے

حروف کی شکلوں کو زاویہ دار بنادیا اور گولائیاں غائب ہوگئیں۔ چونکہ یہ خط صدیوں مستعمل رہا اور مختلف ملکوں میں اس کی اشاعت ہوئی اس لئے ہمیں تعجب نہ ہونا چاہئے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے حروف کی شکلوں میں قدرے فرق ہے

سوئیڈن کے ماہر حفریات (B. SALIN) کی تحقیقات کے مطابق رونی خط کا آغاز جنوبی مشرقی یورپ کے گوتھ لوگوں میں ہوا تھا۔ یہ لوگ بحیرۂ اسود کے قریب اور دریائے ڈنیپوب کے نشیبی حصے میں آباد تھے۔ چنانچہ اس دریا کی وادی نیز رومانیہ میں رونی خط کے متعدد کتبے پائے گئے ہیں۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ بحیرۂ اسود کے شمالی مغربی ساحل سے اس خط کا رواج گوتھ حکومت کے آخری سرے تک پہونچ گیا جسے انھوں نے تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں بحیرۂ اسود اور بالٹک کے درمیان قایم کیا تھا۔ غالباً پانچویں صدی عیسوی میں رونی خط ڈنمارک سے جرمنی اور انگلستان پہونچا۔

(۲) اینگلو سیکسن رونی خط۔ سیکسن وہ قوم تھی جس نے پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں انگلستان کو فتح کرلیا تھا۔ اور وہاں کے قدیم باشندوں سے مخلوط ہوگئی تھی۔ یہی مخلوط النسل لوگ اینگلو سیکسن کہلائے۔ اینگلو سیکسن رونی خط ۲۸ حروف پر مشتمل تھا اور نویں صدی عیسوی تو یہ تعداد بڑھکر ۳۳ تک پہونچ گئی۔ اس رسم خط کا علم ہمیں نہ صرف کتبوں سے حاصل ہوتا ہے، بلکہ بعض مسودے بھی محفوظ ہیں جو نویں سے گیارھویں صدی عیسوی تک کے ہیں۔ انگلستان میں رونی خط کا استعمال پورے اینگلو سیکسن عہد میں جاری رہا۔ آخری دور میں بعض رونی حروف رومن خط کے ساتھ ساتھ قدیم انگریزی کتبات میں استعمال کئے جاتے رہے مثلاً حروف تھارن (تھ) اور وین (ڈبلیو) نارمن حملے کے بعد بھی مستعمل رہے۔

(۳) اسکینڈی نیویائی رونی خط۔ یہ خط ڈنمارک، سوئیڈن، ناروے، کمبرلینڈ اور آئل آف مین میں رائج تھا۔ اینگلو سیکسن خط کے برخلاف اس میں حروف کی تعداد گھٹانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اسکینڈی نیویائی خط میں ۸۰۰ء کے بعد سے ۱۶ حروف کام آتے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک ایک حرف متعدد آوازیں ظاہر کرتا تھا مثلاً ک اور گ، ت اور د چار آوازوں کے لئے محض دو نشانات تھے۔ حروفِ علت کا حال اس سے بُرا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کی زبان میں تیس یا چالیس آوازیں تھیں جبکہ اصل رونی خط میں حروف کی تعداد محض ۲۴ تھی۔ حروف کی تعداد گھٹانے کے لئے غیر ضروری نشانات ترک کئے گئے مثلاً :۔

اور بعض مشکل حروف کی جگہ سہل نے لے لی :۔

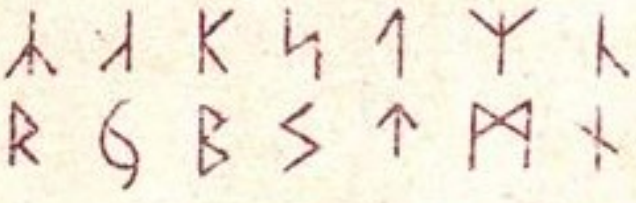

اس خط میں بعض حروف کے نام اینگلو سیکسن ناموں سے مختلف ہیں جیسے تیسرے حرف کو تھرس (thurs) کہتے تھے بہ معنی "دیو" بجائے تھارن (thorn) کے بہ معنی "کانٹا" اسی طرح پانچویں کو کون (Kaun) کہتے تھے بہ معنی "رسولی"۔ "پھوڑا" بجائے کین (Can) کے جس کے معنی "مشعل" کے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے حروف کے نام اور اُن کے معنی بھی مختلف ہیں جیسا کہ بتایا جاچکا ہے حروف کے معنی اور اُن کی شکلوں میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

(باقی)

محمد اسحاق صدیقی

آواز	بوتھا کو کائی	ایلباسن	ممکن یونانی ماخذ
ا			
ب			
ے			
دھ			
ای			
ز			
ای			
ھ			
!			
ک			
ل			
ر			

آواز	بوتھا کو کائی	ایلباسن	ممکن یونانی ماخذ
ن			
کش			
او			
پ			
ر			
س			
او			
ت			
او			
ف			
کھ			
او			

آواز	بوتھا کو کائی	ایلباسن	ممکن یونانی ماخذ
د			
د			
ی			
ی			
س			
او			
گھ			
ای			
او			
را			

آواز	بوتھا کو کائی	ایلباسن	ممکن یونانی ماخذ
ا			
ب			
ے			
دھ			
ای			
ز			
ای			
ھ			
!			
ک			
ل			
ر			

مرکب حروف

بوتھا کو کائی		ایلباسن		
کائی		دیش		اس
کس		بندیش		پس
		ش		مب
		دس		ست
دز		ندس		شس
		نگھ		شائی
دس		گائی		شت
مذی		نگائی		ت
نگ		لائی		تس
		کائی		

اسکینڈی نیوین	اینگلو سیکسن	ابتدائی ٹیوٹانی یا گوتھک	معنی		آواز	نام	
			اسکینڈی نیوین	اینگلو سیکسن		اسکینڈی نیوین	اینگلو سیکسن
ᚠ	ᚠ	ᚠ	مال	روپیہ	ف	فے، فا	فیہ
ᚢ	ᚢ	ᚢ	جنگلی بیل	جنگلی بیل	اُ	اُر	اُر
ᚦ	ᚦ	ᚦ	دیو	کانٹا	تھ	تھرس	تھارن
ᚨ	ᚩ	ᚨ	دیوتا	دیوتا	ا، او	اوس	اوس
ᚱ	ᚱ	ᚱ	سفر	سوار ہونا	ر	ریدھ	راؤ
ᚲ	ᚳ	ᚲ	پھوڑا	مشعل	ک	کَون	کین
ᚷ	ᚷ	ᚷ		تحفہ	گ		کیفو
ᚹ	ᚹ	ᚹ		خوشی	و		وین
ᚺ	ᚻ	ᚺ	اولہ	اولہ	ہ	ہگل	ہیگل
ᚾ	ᚾ	ᚾ	ضرورت	ضرورت	ن	ناؤڈ	نیڈ
ᛁ	ᛁ	ᛁ	برف	برف	اِ	اِس	اس
ᛃ	ᛄ	ᛃ	سال	سال	ے ی ج گ	اَر	گیر
ᛇ	ᛇ		میوہ کا درخت		اِی		ایہ
ᛈ	ᛈ		؟		پ	پرک	پیورتھ
ᛉ	ᛉ				کس، ز	ایلگم	اِلکس
ᛊ	ᛋ	ᛋ	سورج	سورج	س	سال	سجل
ᛏ	ᛏ	ᛏ	عزت	دیوتا	ت	تِر	تیر
ᛒ	ᛒ	ᛒ	برچ کا درخت	برچ کا بیج	ب	ہیارکن	برک
ᛖ	ᛖ	ᛖ		گھوڑا	اے		ایک، ایہہ
ᛗ	ᛗ	ᛗ	انسان	انسان	م	مدھر	مَین
ᛚ	ᛚ	ᛚ	پانی، سمندر	سیال	ل	لوگر	لاگو
ᛜ	ᛝ				نگ		اِنگ
ᛞ	ᛞ	ᛞ		دن	د		ڈایگ
ᛟ	ᛟ	ᛟ			او	اوتھل	اوتھل
					ایا		ایر
					ق		قیورتھ
					ست		ستان

:: READING ROOM ::
:: Hindustani Library ::
P-28, Garden Reach Rd. Cal-24.
No..... Date .....

عورت اور تعلیم

(ایک استفسار کے جواب میں)

ہر چند ضمنی طور پر میں اپنا خیال اس مسئلہ پر ادا ظاہر کر چکا ہوں لیکن براہ راست اس مبحث پر کبھی گفتگو نہیں کی گئی نہ صرف اس خیال سے کہ اس گفتگو میں اب کوئی لذت باقی نہیں رہی بلکہ اس لئے بھی کہ عورتوں کی تعلیم اور ان کی آزادی اپنی نوعیت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی غور طلب کیوں نہ ہو، اب اس کو مناسب حدود کے اندر رکھنا دشوار ہے اور اس کے خلاف آواز بلند کرنا سیل زمانہ کا مقابلہ کرنا ہے جس کا نتیجہ معلوم۔ لیکن باوجود اس احتراز و احتیاط کے

ہتوں کے باب میں آخر کلام آ ہی گیا

اس لئے میں ایک حد تک اپنے خیالات ذرا واضح طریق پر ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

آپ کے خیالات کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ: "عورتوں کو بالکل مردوں کی طرح تعلیم حاصل کرنی چاہیئے اور ہر وہ آزادی جو تعلیم سے پیدا ہوتی ہے ان کے لئے روا رکھنی چاہیئے"۔ میں کہتا ہوں کہ "عورتوں کی تعلیم ضرور مکمل ہونی چاہیئے، لیکن وہ تعلیم ایسی نہ ہو جو ان کے اندر آزادی کی بیجا خواہش پیدا کر دے"۔ بالکل یہی نظریہ میرا مردوں کی تعلیم کے متعلق بھی ہے، یعنی جس طرح میں عورتوں کی ناروا آزادی کو پسند نہیں کرتا، اسی طرح مردوں کی بیجا خودسری بھی مجھے پسند نہیں آتی۔

اس لئے اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ بیجا آزادی کیا ہے۔ "بیجا آزادی" نام ہے "داعیات فطرت و اخلاق" کے خلاف عمل کرنے کا اور اس لئے ہر وہ تعلیم (خواہ اس کا تعلق حکمت نظریہ سے ہو یا حکمت عملیہ سے) جو اس عمل پر مجبور کرتی ہے یا ایسے عمل سے باز نہیں رکھتی بیجا آزادی کا باعث کہلائے گی۔

اچھا آیئے اب ایک نگاہ "داعیات فطرت و اخلاق" پر بھی ڈال لیں اس سے غالباً آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ فطرت صرف یہ چاہتی ہے کہ تمام افراد انسانی نظام تمدن میں بہیئت اجتماعی کے لئے مفید ثابت ہوں۔ اس لئے میرے نزدیک یورپ کی موجودہ ترقی جسے آپ ذہنی ترقی کہتے ہیں اور میں اسے صرف میکانکی ترقی سمجھتا ہوں، اقتضائے فطرت کے خلاف ہے، کیونکہ وہ نظام تمدن کے لئے مفید ثابت ہونے کے بجائے مضرت رساں ہے اور بجائے ہمدردی و اخوت کے جو ہیئت اجتماعی کے قیام کی اولین شرط ہے وہ بغض و عناد، مکر و فریب، حیلہ و سیہ کاری سکھاتی ہے، اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ ادنیٰ تامل سے ہر شخص اس کو سمجھ سکتا ہے اور نود یورپ کے بعض سنجیدہ دماغوں نے اس کا اعتراف کر لیا ہے، اس لئے اب یہ امر بالکل واضح ہے کہ نوع انسان کی نجات یورپ کی تقلید میں نہیں ہے، بلکہ ہمیں کسی ایسے نظام عمل کی ضرورت ہے جو ہماری ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی ترقی بھی پیدا کرے لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ روحانی ترقی کے سلسلہ میں مشرق کا حوالہ دیتے ہیں اور میں "صدیق و فاروق" کو پیش کرتا ہوں:

من از آتش دخان مینم تو آتش از دخاں بینی

یہ تو آپ بھی تسلیم کرتے ہوں گے کہ دنیا کا نظام تقسیم عمل پر منحصر ہے اور ہر شخص یا ہر جماعت دنیا کے تمام کاموں کو انجام نہیں دے سکتی

یہی سبب ہے کہ فطرت نے ہر شخص کے دماغ کو ایک خاص کام کے لئے وضع کیا ہے اور اس کے خلاف جب کوئی دوسرا کام اختیار کرتا ہے تو اس میں کامیاب نہیں ہوتا، پھر ظاہر ہے کہ جب ایک ہی جنس کے افراد کا دماغی اقتضاء ایک نہیں ہے تو دو مختلف جنس کے متعلق فطرت کے داعیات کیونکر یکساں ہو سکتے ہیں — اگر قدرت کا مقصود یہ ہوتا کہ عورتیں بھی تمام وہی کام انجام دیں جو عام طور پر مرد انجام دیتے ہیں، تو دونوں کی جسمانی ساخت، دماغی ترکیب، نفسیاتی میلان ایک ہوتا، لیکن چونکہ اس کا مقصود شروع ہی سے واضح طور پر اس تفریق کو نمایاں کر دینا تھا، اس لئے مرد عورت کے درمیان صورت و سیرت دونوں اعتبارات سے اس قدر کھلا ہوا فرق پیدا کر دیا کہ وحشی سا وحشی انسان بھی بیک نظر اسے سمجھ سکتا ہے، پھر اب غور کیجئے کہ اس فرق سے کیا مراد ہے اور وہ کیا تقسیم عمل ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے باہم تعاون و ہمدردی کا باعث ہوتی ہے۔

مرد کی جسمانی ساخت کہہ رہی ہے کہ وہ زیادہ محنت و جفاکشی اور زیادہ صعوبت و سختی برداشت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے (اُن چند مثالوں سے بحث نہ کیجئے کہ بعض عورتیں اپنی کوشش سے بہت سے مردانہ کاموں میں برابر کا حصہ لے رہی ہیں، جس طرح میں اُن بعض ضعیف مردوں سے بحث نہیں کرتا جنھوں نے اپنے اوپر زنانیت طاری کر لی ہے) جس کا ثبوت ارتقاء عالم کی تاریخ سے بھی ملتا ہے، برخلاف عورت کے کہ اس کی جسمانی و دماغی ترکیب کا اقتضاء صرف رفق و ملاطفت، نرمی و محبت ہے، پھر ایک مرد کے لئے میدانِ ترقی وہی ہے جہاں اُسے زیادہ محنت سے کام لینا پڑے اور عورت کا ارتقاء یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو زیادہ تسلی بخش، زیادہ باعثِ سکون بنائے۔

یہ امر غالباً آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ جس طرح دنیائے عمل میں حرکت کے ساتھ قیام حرکت یا استمرار حرکت کے لئے کسی اور محرک یا قوت کی ضرورت ہے، اسی طرح مرد کی محنتوں اور صعوبتوں کے ساتھ کسی ایسی چیز کی بھی ضرورت ہے جو ان محنتوں کو قایم رکھے، جو ان صعوبتوں کو مرد کے لئے ناقابل برداشت نہ بننے دے، یعنی اگر مرد دن بھر محنت کرتا ہے تو رات کو اسے سکون کی بھی ضرورت ہے یعنی اگر وہ آفتاب کی گرمی میں سخت کاموں سے اپنے آپ کو تھکاتا رہتا ہے، تو چاند کی برودت میں اُسے کسی ایسے بات کی بھی ضرورت ہے جو اس کی خشکی دور کرے اور آیندہ صبح کی محنتوں کے لئے اس میں پھر تازہ قوت و جوش پیدا کر دے، پھر کیا کوئی شخص اس سے انکار کر سکتا ہے کہ ایک مرد کے لئے سب سے زیادہ سکون بخش چیز صرف عورت کا ہاتھ ہے اور مادی ایذا کی خلش صرف عورت ہی کی روحانیت دور کر سکتی ہے، پھر چونکہ یہ تقسیم خود قدرت کی قایم کی ہوئی ہے اس لئے ہمیں اسی کو معیار بنانا چاہئے، اور اسی معیار کے مطابق ایک مرد کی مردانگی اور ایک عورت کی نسائیت پر حکم لگانا چاہئے

فرض کیجئے کہ ایک گھر میں صرف دو میاں بیوی ہیں اور آپ کے خیال کے مطابق دونوں ترقی یافتہ ہیں، اگر مرد سارا دن مکانیکی تجربات میں اپنے آپ کو تھکاتا رہتا ہے، تو عورت بھی کیمیائی معمل میں اپنا سر کھپاتی رہتی ہے، شام کو دونوں خستہ و مضمحل ہو کر گھر واپس آتے ہیں اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ آرام کی ضرورت ہے، لیکن چونکہ وہ گھر میں میسر نہیں آسکتا، اس لئے دونوں اسی خستگی کے عالم میں رات بسر کر دیتے ہیں اور پھر صبح کو اپنے کام میں لگ جاتے ہیں، آپ سمجھتے ہیں کہ اس نوع کی زندگی کب تک بسر ہو سکتی ہے، یا وہ کب تک اسی طرح اپنے اپنے مشاغل میں کامیابی کے ساتھ مصروف رہ سکتے ہیں، میرے خیال میں تو اس کی عمر بہت کم ہے اور تھوڑے زمانہ میں دونوں دماغوں کو بیکار ہو جانا چاہئے۔ بلکہ میری مراد اُس تسکین سے ہے جو روحانی اضطراب کو دور کر سکے، اب اسی کے ساتھ اگر آپ اولاد کو بھی پیشِ نظر رکھیں گے تو اور زیادہ نمایاں طور پر آپ کو رجالی و نسوانی فرائض کا فرق معلوم ہو جائے گا۔

یقیناً اس حد تک آپ میرے موافق ہوں گے لیکن دل ہی دل میں یہ بھی کہہ رہے ہوں گے کہ اس سے آزادی نسواں یا ترقی نسواں کیونکر ممنوع قرار دی جا سکتی ہے مگر غور کرنے سے فیصلہ اسی جگہ ہو جاتا ہے، کیونکہ میرے نزدیک وہی آزادی نسواں مبغوض ہے جو عورت کو اپنے فرائض و وظائف فطری کی طرف سے غافل کر دے اور عورت کی موجودہ تعلیمی و ترقی بدقسمتی سے اسی نوع کی آزادی پیدا کر رہی ہے۔

عورت کا اپنے آپ کو دماغی اعتبار سے مرد کے برابر سمجھنے کا حق یقیناً حاصل ہے، لیکن میرے نزدیک اس حق کا وہ مفہوم نہیں ہے جو آپ نے متعین کیا ہے کہ "خواہ وہ شاعری و فسانہ نگاری شروع کر دے یا راہ نجات و بہشتی زیور کی تفسیر" کیونکہ یہیں سے اُس ناروا جسارت یا آزادی کی بنیاد شروع ہو جاتی ہے جسے میں اقتضاء فطرت کے خلاف سمجھتا ہوں۔ بلکہ اس برابری کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح مرد

اپنے دماغ سے کام لیکر مادی ذرایع ترقی فراہم کرنے کا اہل ہے اسی طرح ایک عورت اپنے دماغی مساعی سے روحانی اسباب راحت وسکون مہیا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے پھر اب فیصلہ آسان ہے کہ یہ مقصود اس کی فسانہ نگاری سے پورا ہوتا ہے یا راہِ نجات و بہشتی زیور کی تفسیر سے۔

عورتوں کی تعلیمی و ذہنی ترقی کی حمایت کی جارہی ہے، اس کا تعلق صرف انگریزی تعلیم سے ہے یعنی زیادہ زور اسی پر دیا جارہا ہے کہ لڑکیاں انگریزی مدارس میں بھیجی جائیں، کالجوں میں پڑھیں اور مردوں کی طرح مخصوص امتحانات میں کامیابی حاصل کریں، اس کے علاوہ اور کوئی نقطۂ نظر حامیانِ تعلیم نسواں کا نہیں ہے، لیکن میں اس کا مخالف ہوں، اس لئے نہیں کہ انگریزی زبان سیکھنا گناہ ہے، یا اور دوسرے علوم جن کی کالجوں میں تعلیم دی جاتی ہے غیر ضروری ہیں بلکہ صرف اس بنا پر مخالفت کرتا ہوں کہ اس تعلیم سے نہ صرف یہ کہ عورت اپنے فرایض سے آگاہ نہیں ہوتی بلکہ اپنی نسائیت بھی کھو بیٹھتی ہے۔

انگریزی تعلیم کا سب سے پہلا اثر جو عورتوں پر ہوتا ہے وہ احساس فرائض کا ضعف ہے، ابھی ابتدائی تعلیم کے مدارج بھی طے نہیں ہوتے کہ سب سے پہلے یہ خیال اُن کے دماغ میں مرتسم ہو جاتا ہے کہ مرد ہمارے اوپر ظلم کر رہے ہیں حالانکہ انھیں کوئی حق ہمارے اعمال کے احتساب کا نہیں ہے" جہاں تک میں نے غور کیا ہے یہ نتیجہ تعلیم کا نہیں ہے بلکہ اُس ماحول کا ہے جہاں وہ تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ انگریزی مدرسوں اور کالجوں کی فضاء میں وہ انھیں عورتوں کو دیکھتی ہیں جو دُنیا میں آزاد ہیں، اخلاقیات سے عملاً منحرف ہیں، مادیات میں پھنسی ہوئی ہیں اور جن کی تہذیب و شایستگی کا بڑا معیار اُن کے لباس کی پاکیزگی اور اوضاع آرایش کا تنوع ہے۔ اس لئے جو لڑکیاں وہاں جاتی ہیں اُن میں بھی قدرتاً یہی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی اپنے آپ کو ویسا ہی بنائیں، پھر اگر وہ غریب یا متوسط طبقہ کی ہیں تو ان کے والدین ان بیجا خواہشوں کے مصارف پورے نہیں کرسکتے اور لڑکیاں جو ناسمجھ ہوتی ہیں اس مجبوری کو بھی ظلم ہی سمجھنے لگتی ہیں اور اس طرح ایک قلبی بغاوت والدین کی طرف سے شروع ہوجاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس وقت لڑکی اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوکر نکلتی ہے اس کے دل میں والدین کی محبت اور ان کا احترام باقی نہیں رہتا، یہاں تک کہ نکاح کے مسئلہ میں بھی وہ اپنے آپ کو آزاد سمجھ کر خود ہی اپنے انتخاب پر اعتماد کرنا چاہتی ہے جو اسکی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اکثر و بیشتر نامناسب و غلط ہوا کرتا ہے اور اگر اتفاق سے کوئی مرد اسی کا ہم خیال مل گیا تو چند دن کے بعد جب عارضی لذتیں ختم ہوکر روحیں حقیقی موانست کی جستجو کرتی ہیں تو ان تمام مصائب کا سامنا ہوجاتا ہے جو لازمی نتیجہ ہیں ایسے غیر حقیقی اتصال کا۔

اس میں شک نہیں کہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی (آپ کے نقطۂ نظر سے) بظاہر نہایت دلکش، حد درجہ جاذب قلب و نگاہ اور ہر لحاظ سے ایک ایسا پیکر جمیل نظر آتی ہے کہ مشکل سے ایک مرد اپنی جذبات فتادگی پر قابو حاصل کرسکتا ہے لیکن چند دن نہیں گزرتے کہ یہ طلسم دور ہوجاتا ہے اور پھر اُس وقت معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم نے دارودئے دل سمجھ کر حاصل کیا تھا وہ صرف جراحتِ زندگی ہے اور جس کو ہم نے اس قدر جمیل و دلکش سمجھا تھا اس کا یہ حال ہے کہ:-

حسنش ہمہ قتل است و نگاہش ہمہ خون است

میں کیسے سمجھوں کہ مسئلہ نسائیات کے متعلق آپ نے اہل مغرب کے جدید افکار کو ملاحظہ نہیں فرمایا اور اگر ملاحظہ فرمایا ہے تو کیونکر یقین کرسکتا ہوں کہ آپ پھر بھی آزادیِ نسواں کے حامی ہیں، کیا آپ کو علم نہیں کہ یورپ کا مرد عورتوں کی اسی آزادی کی بدولت زندگی سے بیزار ہے اور عورتوں کی اسی حقوق طلبی، اسی حریت فکر اور اسی دماغی و ذہنی ترقی نے وہاں کی حیاتِ انسانی کا توازن اس قدر خراب کردیا ہے کہ ایک لمحہ کا حقیقی آرام نصیب نہیں، اب مغرب کی عورت جو اسی تعلیم و آزادی کا انتہائی نمونہ ہے (جس کی ابتدا ہندوستان میں بھی ہوگئی ہے اور جس کے آپ اس قدر دلدادہ نظر آتے ہیں) بقول ایک انگریز مصنف کے "عورت تو رہی نہیں، اور مرد بھی اسے نہیں کہہ سکتے، اس لئے وہ ایک تیسری جنس ہے، جسے خود مرد نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے" اور اب آپ اس کے ہاتھوں نالاں ہیں۔

انسانی معیشت و معاشرت ایک ایسی گاڑی ہے مرد و عورت دونوں برابر قوت سے کھینچتے ہیں، یعنی اگر مرد کماتا ہے تو عورت کا فرض ہے کہ وہ اس کی کمائی کا انتظام کرے، بچوں کی پرورش کرے، امور خانہ داری کا خیال رکھے، شوہر کے آرام و آسایش کی فکر کرے

جو بجائے خود بڑا کام ہے اور مرد کے فرایض سے کسی طرح کم نہیں ہے اس لئے اگر عورت میں یہ احساس ضعیف ہو جائے اور وہ بھی مرد کی خدمات انجام دینے لگے تو نظام عالم کیونکر قایم رہ سکتا ہے اور نسل انسانی کیونکر ترقی کر سکتی ہے۔

الغرض مقصود صرف یہ ہے کہ اگر عورت اپنے فرایض سے غافل ہے تو اس سے زیادہ مضر چیز دنیا میں کوئی نہیں۔ عام اس سے کہ یہ غفلت نتیجہ ہو جہل کا یا علم کا اگر جہل کی وجہ سے یہ عیب پیدا ہوا ہے تو اُسے دور کرنا چاہئے اور اگر علم سے یہ مرض ظہور میں آتا ہے تو اس کو خیرباد کہنا چاہئے۔

مسلمانوں میں اس سے قبل قرونِ وسطیٰ اور قرونِ اولیٰ میں بھی عورتوں کی تعلیم کا رواج تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ عہدِ اسلامیہ نے کیسی کیسی ذہین و قابل عورتیں پیدا کیں، لیکن اُن میں شاید ایک۔ مثال بھی ایسی نہ ملے گی کہ اس نے اپنے حقیقی فرایض کو نظر انداز کر دیا ہو، اس لئے ثابت ہوا کہ نفسِ تعلیم تو کبھی مضرت رساں نہیں ہو سکتی، البتہ اس کے ساتھ تربیت کا فقدان یا بُرے ماحول کا اثر اور عام درسگاہوں کی فضا اس خرابی کا باعث ہوا کرتی ہے، جس کے ثبوت میں اس وقت سارا یورپ اور اس کی تمام عورتیں پیش کی جا سکتی ہیں، ہاں اگر ہندوستان کے انگریزی مدارس کا نصاب تعلیم مغربی نصاب کے علاوہ کچھ اور ہوتا یا معلمات کی ذہنیت کچھ اور ہوتی یا تعلیم گاہوں کی فضا سے کچھ بھی اخلاق کا پتہ تو بیشک کسی اور نتیجہ کی توقع ہو سکتی تھی، لیکن جبکہ یہاں بھی وہی سب کچھ ہے جس نے یورپ کی عورت کو ایک تیسری جنس بنا دیا، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کی عورت بھی اس ناشدنی جنس میں شامل ہونے سے باز رہے اور مشرق اُس بلا سے محفوظ رہے جس میں آج کل مغرب نظر آ رہا ہے۔

اب رہا میرا خصوصیت کے ساتھ غزل نگاری اور عشقیہ فسانہ نویسی کی مخالفت کرنا سو اس کا سبب سوا اس کے کچھ نہیں کہ جن لڑکیوں میں ابتدا ہی سے یہ ذوق پیدا ہو جاتا ہے وہ آگے چل کر کبھی مفید عضو تمدن نہیں بن سکتیں۔ اگر کوئی عورت اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد، متاہلِ زندگی کے فرایض بخوبی ادا کرتی ہوئی پختہ عمر میں جا کر یہ مشغلہ اختیار کرے، تو میں اس کو چنداں مضرت رساں نہیں سمجھتا حالانکہ مناسب یہ بھی نہیں ہے اور اس سے گھر کی لڑکیوں کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے، لیکن کمسنی کے زمانہ میں جبکہ ابھی ابتدائی مدارج بھی تعلیم کے ختم نہیں ہوئے ہیں، لڑکیوں میں یہ ذوق پیدا ہو جانا قیامت ہے۔

چشم اگر این ست و ابرو ایں و ناز و عشوہ ایں
الفراق اے ہوش و تقویٰ الوداع اے عقل و دیں

سو حضرت، میں نہ مخالف تعلیم کا ہوں اور نہ مناسب آزادی کا۔ لیکن ڈرتا ہوں اس کے نتائج سے۔

من از عقرب نمی ترسم، رے از نیش می ترسم

اب اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر لڑکیوں کی تعلیم کا کیا انتظام ہونا چاہئے اور اس کی بہترین صورت کیا ہے؟ میں نے جہاں تک غور کیا ہے اور غور کرنے کے بعد عمل کیا ہے، عمدہ تدبیر یہ ہے کہ پہلے لڑکیوں کو گھر میں تعلیم دی جائے اور یہ تعلیم یکسر مذہبی اخلاقی ہونی چاہئے، اسی سلسلہ میں فارسی اور عربی کی بھی تعلیم ضروری ہے (جس کا نصاب ہر شخص کو لڑکی کی ذہنی حالت اور فطری ذوق کے لحاظ سے مرتب کرنا چاہئے) اگر پانچ سال کی عمر سے بھی اس کی ابتدا کی جائے تو دس بارہ حد تیرہ سال کی عمر میں یہ منزل ختم ہو سکتی ہے، اس کے بعد انگریزی شروع کرائی جائے اور اسی کے ساتھ ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ کو بھی شامل کرا دیا جائے لیکن یہ سب کچھ گھر ہی میں ہونا چاہئے، اگر گھر میں ممکن نہیں ہے تو کسی اچھے مدرسہ میں داخل کرانا چاہئے بشرطیکہ اس پر پہلے کافی رنگ اخلاق کا چڑھ گیا ہے لیکن اگر اطمینان نہیں ہے یا مدرسہ میں داخل کرنے کے بعد لڑکی کا ذوق نامناسب حدود کی طرف مایل ہوتا ہوا نظر آتا ہے تو مدرسہ کی تعلیم فوراً ترک کرا دینی چاہئے، ہر چند جب شروع میں تربیت اچھی ہو جاتی ہے تو بعد کو اس نوع کی خرابیاں کم پیدا ہوتی ہیں۔ تاہم ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض طبائع پر بُرا رنگ بہت جلد چڑھ جاتا ہے اور اچھے اثرات جلد زایل ہو جاتے ہیں اس لئے مدرسہ میں داخل کرنے کے بعد لڑکیوں کی طرف سے غافل ہو جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

میں لڑکیوں کے لئے امتحانات میں شریک ہوکر اسناد حاصل کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں، جبکہ قابلیت کے لحاظ سے حامل اسناد لڑکے بھی کچھ نہیں ہوتے لیکن اگر کوئی شخص اس کو ضروری خیال کرتا ہے، تو اس کی بھی بہترین صورت یہی ہے کہ پرائیویٹ طور سے تعلیم حاصل کرکے امتحانات میں شرکت کی جائے جس کی بعض مثالیں ہندوستان میں پیش کی جاتی ہیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر کوئی زنانہ کالج ایسا منتخب کیا جائے جہاں اوہام سے زیادہ حقایق کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی ہو۔ اگر ان تمام شرائط کو ملحوظ رکھا جائے تو فی الحال شاید چند لڑکیاں ہندوستان میں ایسی نکلیں گی جن کا مدرسہ میں داخل کرنا روا سمجھا جائیگا ورنہ اکثر کا حال اسی کا مقتضی ہوگا کہ پہلے ان کی تعلیم و تربیت گھر میں کی جائے، مجھے اس جگہ یہ بیان کردینا چاہئے کہ اس وقت چلنے زنانہ مدرسے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو یا تو کسی چرچ مشن سے تعلق رکھتے ہیں یا حکومت کے قایم کئے ہوئے ہیں اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ سب کے سب ناقص ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ قوم کی طرف سے ایسے مدرسے قایم کئے جائیں، اور ان کا نصاب کامل غور کے بعد مقرر کیا جائے، لیکن یہ اسوقت ممکن ہے جب ہمارے دلوں میں سچا درد پیدا ہو جائے اور عورتوں کی اصلاح کا حقیقی خیال پیش نظر ہو ورنہ اگر ہمارے خیالات کی بلندی یہی ہے اور اصلاح کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ لڑکیاں مشن اسکولوں میں جاکر تھوڑی سی انگریزی اور بہت سی فیشن طرازی سیکھ لیں تو نتیجہ معلوم اور عورتوں کے ساتھ مردوں کا حشر بھی متحقق۔

دریغا آبروئے دیر گر غالب مسلماں شد

پردہ کی بات پردہ میں

میری رائے میں بعض مباحث ایسے ہیں جن میں متانت و سنجیدگی کا دخل بالکل نہ ہونا چاہئے، اور انھیں میں سے ایک پردہ بھی ہے، کیونکہ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ جہاں معاشرتی، اخلاقی یا مذہبی نقطۂ نظر سے اس پر گفتگو کی گئی اور سارا لطف خاک میں مل گیا، نتیجہ جو کچھ ہوتا ہے وہ تو ظاہر ہے کہ اگر اب جبرئیل بھی ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی پر کھڑے ہوکر خدا کا یہ حکم پہونچائیں کہ: "پردہ عورت کے لئے ضروری ہے" تو بھی عورت اب ماننے والی نہیں ہے، کہتے ہیں کہ آدم اسی کے بہکانے سے بہشت سے باہر نکلے، لیکن عورت کی شکایت آدم سے یہی ہے کہ میں نے بہکایا تھا تو سارا الزام اپنے سر لے کر خود ہی نکل جاتے مجھے اپنے ساتھ کیوں نہ شامل کرلیا" وہ تو ضرور بدلہ لے گی، خواہ آپ کی شاعری یا حسن و عشق کی دنیا ویران ہی کیوں نہ ہو جائے وہ زمانہ گزر گیا جب کسی کو یہ فکر رہتی تھی کہ ؎

چہ سان نقاب ز رخسار دوست برگیرم
مگر فتحش کنارد برانداختم نقاب"

اور کوئی اپنی کامیابی کے اس پہلو سے خوش ہو جایا کرتا تھا کہ: ؎

ظہوری غریب یہ کہتا ہی رہا کہ ؎

بکش پردہ بر چہرہ اے رشکِ ماہ
کہ دارد نقاب از ہجوم نگاہ

لیکن اُس کے عہد کے کسی حسین نے کہنا مانا اور نہ اب کوئی مانے گا۔ پھر جب حالت یہ ہے کہ دعا یہی مانگنا چاہئے کہ خدا کرے پردہ جلد اُٹھ جائے، کسی آرزو کے پورے نہ ہونے پر غالب کا یہ فلسفہ مجھے بہت پسند ہے:

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

خضر کی درازیٔ عمر ہماری دعا کی محتاج نہیں لیکن جب ہماری التجا سے اُن کی عمر کم نہیں ہو سکتی تو پھر اُن کی درازیٔ عمر ہی کی دعا مانگنا چاہئے کہ ان پر احسان نہ سہی تو کم از کم اپنی خفت ہی کم ہو جائے گی

یورپ میں تو خیر یہ مسئلہ اس حد سے گزر گیا ہے کہ اس پر کسی قسم کی گفتگو ہو سکے اور میں مغرب کی تعریف اسی لئے کرتا ہوں کہ جو کچھ اُسے کرنا ہوتا ہے کر گزرتا ہے اور "کروں یا نہ کروں" کے اندیشہ میں اپنا وقت ضایع نہیں کرتا، برخلاف ہندوستان کے کہ یہاں صدیاں تیور ہی دکھانے میں گزر جاتی ہیں اس لئے میں تو یہی کہوں گا کہ یہاں کی عورتیں بھی جس قدر جلد اس جھگڑے کو مٹا دیں اچھا ہے اُن کا پردہ "زنبوری" تو ہو ہی گیا ہے لیکن ضرورت اس سے "کافوری" ہونے کی ہے اور اسی میں دیر ہونے کی وجہ سے آپ کبھی کبھی گھبرا کر یہ سوال کر بیٹھتے ہیں مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہاں کی عورتیں بھی یونہی سوا ہیں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو مہذب و شایستہ سمجھتی ہیں:-

لے بھی جائیں دل کہیں ہم سے کہ تقدس پاک ہے
یہ حسینانِ جہاں بھی دلربا کہنے کو ہیں

مشاعرۂ نگار

اکرم دھولیوی :-
دلفگاری ہے محبت کا تقاضا، سچ ہے — تم کو منظور نہ تھا خونِ تمنا کرنا
راہِ منزل نہ کہیں جوشِ طلب میں کھو جائے — اے دل اتنی بھی نہ منزل کی تمنا کرنا

پیمان کانپوری :-
کس نے دیکھا ہے ترے وعدۂ فردا کا مآل — اک قیامت ہے شبِ غم کا سویرا کرنا

حبیب آروی :-
عظمتِ دردِ محبت پہ یقیں آ ہی گیا — سہل ہے اب مجھے غم تیرا گوارا کرنا

رحمت امروہوی :-
شدتِ غم سے چھلک آئے ہیں آنسو ورنہ — مدعا میرا نہیں آپ سے شکوا کرنا

شفقت کاظمی :-
عشق میں اور کسی کی نہ سُنی ہے نہ سُنیں — ہم کو ہر کام پہ ایمائے تمنا کرنا
جو گزرنی تھی محبت میں سو گزری مجھ پر — بعد میرے نہ مرے حال کا چرچا کرنا

صادق امروہوی :-
اُس نے اِس طور سے دیکھا دمِ پرسش مجھ کو — مجھ سے ممکن نہ ہوا ظلم کا شکوا کرنا

ضیاء انصاری :-
وجہِ تسکین تری یاد کا ہر پہلو ہے — کس کی تقدیر میں ہے تیری تمنا کرنا
نقشِ دیوار بنے بیٹھے ہیں اربابِ جنوں — نگہِ یار ذرا پھر تو اشارا کرنا

ظاہر بھڑگانوی :-
بے رخی میں ہے لگاوٹ تو لگاوٹ میں حیا — دیدنی ہے ترا اس طرح سے دیکھا کرنا

غریب دھولیوی :
آج تک یاد ہیں آغازِ محبت کے مزے — چپکے چپکے وہ تری یاد میں رویا کرنا
مشکلیں ڈوبنے والے کی کوئی کیا جانے؟ — بہت آسان ہے ساحل سے نظارہ کرنا

فائز آصفی :
زیست اک نکتۂ مبہم ہے زمانے کے لئے — عقدۂ گیسوئے خمدار ذرا وا کرنا

قاسم نوری :-
کتنا پُر لطف ہے ہم سے کوئی پوچھے قاسم موسمِ گُل میں بھی کانٹوں کی تمنا کرنا

کیف پرتاب گڈھی :-
بحرِ ہستی میں ہمیشہ رہو طوفاں کے حریف خواہشِ مرگ ہے ساحل کی تمنا کرنا

مائل :-
فکرِ امروز سے فرصت ہی کہاں ہے مائل آج ممکن نہیں اندیشۂ فردا کرنا

محمود درانی :-
اب تو محمود وفا پر بھی بھروسہ نہ رہا تا کجا اس دلِ مجبور کا کہنا کرنا

منظر معصوم :-
اس سے منظر دلِ مضطر کا عبث ہے شکوہ جس نے سیکھا ہی نہیں غم کا مداوا کرنا

نومبر کے لئے ذیل کا مصرع طرح پیش کیا جاتا ہے، ۲۰ اکتوبر تک غزلیں پہونچ جانا چاہئے۔

کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو

قافیہ :- فرمانے ، دیوانے

"نگار" کے پچھلے تین سالنامے

سالنامہ ۳۱ء — جس میں علم "فراست التحریر" کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیکھ کر آپ ایک شخص کا سوا دخط دیکھ کر اس کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں - صرف ایک کاپی باقی ہے ـــــ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۳۷ء — اس میں "ڈراما اصحاب کہف" اڈیٹر کے قلم سے پورا شایع ہوا ہے اور "خلافت و امامت" کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہوا ہے ـــــ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۳۸ء — اس میں تاریخ اسلامی ہند کے عہد خلافت و امامت پر مختتم بحث کی گئی ہے جس کی ابتدا ۳۷ء میں ہوئی تھی ـــــ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

-: Reading Room :-
-: Hindustani Library :-
R-28, Garden Reach Rd. Cal—
No..... Da.. .....

لطفِ مشیت

فضا ابن فیضی :

یہ سحر، دھندلکوں سے بے نیاز ہے کتنی
یہ افق کے مینا سے ڈھل رہے ہیں جلوے سے
رنگ و نور کے عنواں طور طور بکھرے ہیں
مستیاں چھلکتی ہیں پھول کی نگاہوں سے
جلوۂ بہاراں سے لالہ زار سجتے ہیں،
برگِ گل پشیماں ہے التفاتِ شبنم سے
رقص میں ہیں پیمانے چھاؤں میں گھٹاؤں کی
گھل رہا ہے کانوں میں رس سریلی تانوں کا
مل کے مہر و شبنم نے آئینے تراشے ہیں
سرخیِ شفق کا ہے عکس لالہ زاروں پر،
یہ نسیمِ صحرا کی کاوشِ گل افشانی،
رات اپنی زلفوں میں چاندنی سجاتی ہے
شمع و شاہد و صہبا معرکے ہیں ہستی کے
یہ نگاہِ ساقی کی التفاتِ ارزانی،
ابروؤں کی زیبائی، گیسوؤں کی شبتابی،
آنچل اس کا عنابی، اس کا پیرہن دھانی
کائنات کی دوزخ کھو گئی بہشتوں میں
اتنی دلنشیں صبحیں، اس قدر حسیں شامیں

اے خدا! تری دنیا دلنواز ہے کتنی،
یا نقاب الٹ دی ہے زندگی نے چہرے سے
بوئے گل کے افسانے دور دور بکھرے ہیں
ابر تر گزرتا ہے میکدے کی راہوں سے
آبجو کی موجوں میں جلترنگ بجتے ہیں،
کس قدر محبت ہے زخمِ دل کو مرہم سے
آہ! یہ طرب گاہیں دل کشا صداؤں کی
بج رہا ہے کانوں میں ساز عیش خانوں کا
فتنہ گر بہاروں نے بنکدے سنوارے ہیں
بادلوں کے جھرمٹ ہیں بھیگے کوہساروں پر
یہ ہوائے ساحل کی سلسبیل سامانی،
جھلملاتے تاروں میں صبح مسکراتی ہے
کاروبار تازہ ہیں عشق اور مستی کے
یہ ہر ایک جرعہ میں میکدوں کی طغیانی
یہ حسین آنکھوں کی دعوتِ شکر خوابی
عارضوں کے جلوے ہیں مائلِ زر افشانی
راحتیں پروری ہیں کس نے غم کے رشتوں میں
ہم تری مشیت کے ظلم سے پریشاں ہیں

آرزو کے خاکے ہیں رنگ بھر نہیں سکتے
زندگی کو جی بھر کر پیار کر نہیں سکتے

ہجوم ظلمت و صبحِ وطن کی یاد کرو

چمن کی آڑ میں لَو دے رہے ہیں کاشانے
چمن کو پھونک کے سرو سمن کی بات کرو

جو ڈوبتے ہی نہیں اُن نجوم کو دیکھو
جو پھوٹتی ہی نہیں اُس کرن کی بات کرو

ہزار سال سے اُلجھے ہوئے ہیں ظلمت و نور
ہجوم ظلمت و صبحِ وطن کی بات کرو

حدیثِ حشر و حساب و کتاب رہنے دو
فسادِ آدمی و اہرمن کی بات کرو

یہ میکشوں کو اشارہ ہے چشمِ ساقی کا
لہو پیو تو شرابِ کہن کی بات کرو

بہار توڑ گئی موج رنگ و بو کا طلسم
ذرا سنبھل کے گل و یاسمن کی بات کرو

روشِ روش پہ بچھائے گئے ہیں ہوش کے دام
یہی ہے ہوش تو دیوانے پن کی بات کرو

جہاں فسانۂ جبروتِ خسروی چھیڑو
ضرور بیکسیِ کوہکن کی بات کرو

حرم کی خاک پہ لات و منات کیا کم ہیں
یہ کیا ضرور کسی برہمن کی بات کرو

گناہِ عام ہے فکر و نظر کی آزادی
خلوصِ خاص سے دار و رسن کی بات کرو

بہ جبرِ طوق و سلاسل بحکمِ زہر و صلیب
کچھ اور زلفِ شکن در شکن کی بات کرو

ابھی ہے خاکِ شہیداں پہ رقصِ بے کفنی
بہ مصلحت "کلہ و پیرہن" کی بات کرو

حضورِ یزداں

بہار کا خونچکاں ہے دامن سلگ رہے ہیں ایاغ اب تک
گزر گئیں ہیں ہزار صدیاں جلے نہیں ہیں چراغ اب تک

جلے نہیں ہیں چراغ اب تک کسی صنم کے دیار میں بھی
کھلے نہیں ہیں کسی چمن میں گلاب اب تک۔ بہار میں بھی

بہار میں بھی رہے ہیں ویراں گل و سمن کے نگار خانے
ازل سے اب تک : جانے کتنی حقیقتیں بن گئیں فسانے

عجیب خاکے ہیں زندگی کے یہ بادہ خانے یہ جلوہ گاہیں
لہو میں ڈوبے ہوئے ہیں معبد دھواں اُگلتی ہیں خانقاہیں

دلیلِ عظمت یہ طاقِ کسریٰ، یہ نوشِ آذر، یہ تختِ ایراں
یہ نینوا کا پیہ جلال ساحل، یہ شہرِ سقراط کا بیمستاں

یہاں نہ جانے مسیح کتنے صلیب پر چڑھ چکے ہیں اب تک
بلاکتوں کے نہ جانے کتنے فسانے ہم پڑھ چکے ہیں اب تک

نہ جانے کتنے حکیم آئے نہ جانے کتنے رسول گزرے
مگر بہاروں کے راستوں سے کبھی سلامت نہ پھول گزرے

ہزار سجدے کئے ہیں لیکن کھلا نہ بابِ قبول اب تک
جمی ہوئی ہے جبینِ ریحان و گل پہ صدیوں کی دھول اب تک

یہ کون پوچھے کہ آدمی نے کیا ہے کیا معبدوں میں جا کر
ملا ہے ہم کو گماں کا تحفہ یقین کی بھی حدوں میں جا کر

حدودِ عرفاں میں بھی پہونچ کر چراغ جلتے نہیں یقیں کے
بتا رہے ہیں مٹے مٹے سے خطوط انسان کی جبیں کے

مگر کسی نے کہا ہے ہم سے یہ روز و شب کے حصار بھی ہیں
یہ زندگی کے ستون بھی ہیں یہ روشنی کے منار بھی ہیں

ثبوت کافی نہیں ہیں یارب نجوم و ماہ و گل و سمن کے
خرد کی صرصر بجھا چکی ہے چراغ تیری اس انجمن کے

اگر نہیں ہے دلیل کوئی تو پھر یقیں کا سوال کیسا
ترے فلک کا سوال کیسا تری زمیں کا سوال کیسا

اگر یہ سچے چراغ ہیں تو یہ قصر و ایواں کو پھونک ڈالیں
کلاہ و تاج و قبا جلا دیں ہر اک شبستاں کو پھونک ڈالیں

ہر اک شبستاں کو پھونک ڈالیں یہ روحِ برق و شرار بن کر
چمک اٹھیں یہ جبینِ انساں پہ اپنا خود شاہکار بن کر

انتخاب کلام حامد بھوپالی

حامد سعید خاں، عجیب و غریب انسان ہیں، محفل سخن سے علٰحدہ، عمر گزر جائے تو وہ شعر نہ سنائیں اور بزم مشاعرہ ہو تو اپنا کلام اس طرح پیش کریں، گویا وہ کسی بڑی سخت منزل سے گزر رہے ہیں۔ عام شعراء کی طرح وہ "طشت از بام فگندن" کے قایل نہیں۔ حالانکہ ان کا پاکیزہ ذوق سخن اسی کا مقتضی ہے۔

سنا ہے کہ ان کا دیوان زیر ترتیب ہے، لیکن معلوم نہیں کب تک شایع ہو اس لئے ان کے چند اشعار تو آپ اسی وقت سن لیجئے۔ نیاز

نزدیک ہیں وہ دن کہ پس پردۂ جلوہ — پابندی آداب تماشا نہ رہے گی
سن کر کوئی تعبیر نہ دیدے کہیں ورنہ — پاکیزگیٔ خواب زلیخا نہ رہے گی

زندگی میں ایک دن تو ہم کو ملنا چاہئے — زندگی بھر جو یقین سست پیمانی کرے
اس طرح سے بارہا اٹھی ہے شرمگیں نظر — مگر یہ آج دفعتاً سکون دل کو کیا ہوا،
ہزار قافلے رواں ہیں آج راہِ شوق میں — جو ایک کارواں سے میں بچھڑ گیا تو کیا ہوا

ڈوبنا میرے لئے پھر فرض ہی ہو جائے گا — جانب ساحل اگر طوفان نے پھیرا مجھے
سہی کہ برق تپاں ہے مگر ابھی اس کو — مزاج خار و خس آشیاں نہیں معلوم

کچھ اس طرح سے سجائی گئی تھی بزم جمال — کہ باریاب تماشا بھی باریاب نہ تھے
ضبط کی تلخیوں کے ساتھ ہلکی سی آہ بھی سہی — آؤ، جنون شوق میں ایک گناہ بھی سہی

جہاں تھے عشق کے سجدے نہ حسن کی نخوت — میں اس مقام سے بھی آپ کو پکار آیا
تنگ ہے عرصۂ ہستی ترے دیوانے پر — اب یہ صحرا بھی باندازۂ سودا نہ رہا

ہر حسرت نگاہ تری جلوہ گاہ ہیں، — اپنی جگہ پر ایک مکمل سوال ہے
وہ ہر مقام جنوں دیکھنے کے قابل ہے — جہاں رکا ہوں جہاں سے گزر گیا ہوں میں

اسے تلاش کی معراج جانتا ہوں میں — کہ ان کو ڈھونڈ لیا اور کھو گیا ہوں میں
سامنے کی بات ہے سود و زیان عاشقی — یعنی کھوتے جائیے جتنا کہ پاتے جائیے

یہ بھی آداب محبت ہیں کہ حامد عشق میں — زخم کھاتے جائیے اور مسکراتے جائیے

وہ مضطرب کہ سر بام آج جلوۂ عام — میں فکر مند کہ پروردگار کیا ہوگا،
نئے چمن ہیں نئی وحشتیں نئے صحرا — جواب کے آئی تو حشر بہار کیا ہوگا

یہ دنیا ختم ہونے کو تو ہو ہی جائے گی لیکن — فرشتے مدتوں دہرائیں گے تاریخ انساں کی
رُکے رُکے سے ستارے ڈرا ڈرا سا جہاں — مگر مزاج جنوں برہمی پہ آیا ہے،

الٰہی خیر ہو زنداں کی اب کہ پہلی بار — تمام عمر میں دیوانہ مسکرایا ہے
فضائے شوق کی حد ختم ہو گئی ہے جہاں — دل آج ان کو وہاں تک پکار آیا ہے

اسیر اب کہیں ان تیلیوں سے رکتے ہیں — قفس میں اہل چمن کا سلام آیا ہے
وہ دیوانے حقیقت میں متاع موسم گل ہیں — کہ جن کی جستجو میں خود قفس لیکر بہار آئے

کبھی دامن شفق کے کبھی پردۂ سحر کے — وہ نقاب ڈالتے ہو جو نقاب ہی نہیں ہے

افسانۂ اول پہ پھر غور کر رہا ہوں
یہ سوچتا ہوں آخر بھولا ہوں میں کہاں سے
جیروں میں اب کہ وسعت کونین کر رہا ہوں
اک نقطے کو کھو دیا ہے نقطے کے درمیاں سے ہم

راغب مرادآبادی :-

یہ نقش وہ ہے کہ دل سے جسے مٹا نہ سکے
ہمیں جو بھول گئے، ہم اُنھیں بھلا نہ سکے

بساطِ دیر و حرم پر جو چین پا نہ سکے
وہ تیری بزم میں آئے تو آ کے جا نہ سکے

بتائے کون کہ اُن کے دلوں پہ کیا گزری
بہار میں بھی جو ناشاد مسکرا نہ سکے

ہزار مرتبہ رودادِ غم کہی، لیکن
گزر رہی تھی جو دل پر اُنھیں سنا نہ سکے

وہ نامراد کہاں جائے، کچھ بتا ساقی!
رہے جو تشنۂ مے اور زہر کھا نہ سکے

ساحل بلگرامی :-

کرم فروش مری تمکنت گھٹا نہ سکے
تھکے ہوئے بھی قدم میرے لڑکھڑا نہ سکے

فریبِ مرگ نے کچھ اتنا کر لیا مسحور
ہم اپنے حالِ زبوں پر بھی مسکرا نہ سکے

بہار آتے ہی یہ زندگی پر اُوس پڑی
کہ شاخِ گل کو بھی دم بھر گلے لگا نہ سکے

یہ زندگی کا عجب سانحہ ہے اے ساحل
گئے وہ ایسے کہ پھر ہم اُنھیں بُلا نہ سکے

نفیس قادری سونگیری :-

ترے خیال میں دم بھر سکون پا نہ سکے
ہم اضطرابِ غمِ دل کبھی مٹا نہ سکے

غم و الم سے تھی معمور زندگی اپنی
ہزار شکر کہ پھر بھی تجھے بھلا نہ سکے

مقامِ عشق میں یہ بھی خبر نہیں ہم کو
قرار مل نہ سکا یا قرار پا نہ سکے

وہ تیرا راز تری بات ہی نہیں اے دوست
یقین بن کے مرے دل میں جو سما نہ سکے

وہ زندگی کے حقایق سے روشناس نہیں
جنونِ عشق کی جو عظمتوں کو پا نہ سکے

حیات لکھنوی :-

مرے دل کی طرح روشن مرا گھر ہو تو جانے دو
کبھی پیشِ نظر ایسا بھی منظر ہو تو جانے دو

کوئی حد بھی تو ہو اس وعدۂ مبہم سے کیا حاصل
قیامت ہی سہی اک دن مقرر ہو تو جانے دو

مرا مقصود تو یہ ہے کہ جاں نذرِ تجلّی ہو
گراں یہ بھی تمھاری مصلحت پر ہو تو جانے دو

مجھے معلوم ہے میں درخورِ محفل نہیں پھر بھی
جبیں خم اپنے سنگِ آستاں پر ہو تو جانے دو

حیات امید کیسی انتہائے شامِ ہجراں کی
ابھی تو شام ہی ہے صبح محشر ہو تو جانے دو

مضطر حیدری :-

کیوں پھول کھلے کیوں مرجھائے یہ سوچنا میرا کام نہیں
جب گردشِ دوراں کے ہاتھوں میں خود ہی بدلتا رہتا ہوں

رُکی زبان تو اشکوں نے آبرو رکھ لی
ہوا نہ ختم کبھی سلسلہ کہانی کا

ان سفینوں کا ڈوبنا بہتر
جن کو ساحل نظر نہیں آتا

عبث ہے تشنہ لبی کا شکوہ نظامِ فطرت سے میگسارو
نگاہِ ساقی بدل گئی ہے، شراب کی کچھ کمی نہیں ہے

وفورِ شوق میں ہم حدِ امکاں تک تو آ پہونچے
نشانِ راہِ منزل اب خدا جانے کہاں تک ہے

نہ سہی میرا نشیمن رہے پر بہارِ گلشن
مجھے گلستاں کا غم ہے غمِ آشیاں نہیں ہے

سکوتِ بحر کو تم دائمی کہہ لو مگر مضطر
سبک رفتاریِ موجِ رواں کچھ اور کہتی ہے

مطبوعات موصولہ

تاریخ انقلاب حیدرآباد یا مشاہدات

تقسیم ہند کے بعد تاریخ ہندوستان کا اہم ترین واقعہ "انقلاب حیدرآباد" تھا، جس کے صحیح تفصیلی حالات حکومت شایع ہی نہ کر سکتی تھی اور اہل حیدرآباد میں کسی کو اس کی جرأت نہ تھی۔ پھر ٹھیک اسی وقت جبکہ ہندوستان کی تاریخ کا نیا ورق اُلٹا جا رہا تھا اور سلطنت مغلیہ کی آخری یادگار (حکومت آصفیہ دکن) کے نقوش مٹنے جا رہے تھے۔ جناب ہوش بلگرامی (نواب ہوشیار جنگ) نے جو حضور نظام کے خاص درباری اور حیدرآباد کے تمام سیاسی تار و پود کے ایک ایک ریشہ سے واقف تھے۔ اپنی آٹھ بیاگرفی مرتب کرنا شروع کی جس کا اصل مقصود یہ تھا کہ حیدرآباد کی سیاست، دربار آصفی کی سازشوں اور وہاں کی جماعت اتحاد المسلمین کی سرگرمیوں اور ریشہ دوانیوں کی صحیح و جامع تاریخ مرتب کر کے ایک ایسا ریکارڈ پیش کیا جائے جسے ان کے سوا کوئی دوسرا پیش ہی نہ کر سکتا تھا۔

حیدرآباد میں حکومت ہند کا پولیس ایکشن بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ اقدام کیوں اور کس طرح کیا گیا اور اس کے نتائج کیا پیدا ہوئے۔ یہ ایک بڑی دردناک داستان ہے جسے تمام جزئیات کے ساتھ وہی شخص لکھ سکتا تھا جو نظام اور حکومت ہند دونوں کے ارادوں اور اقدامات سے آگاہ ہو اور اُس وقت جبکہ حیدرآباد کے ایک ایک انسان کا دل دھڑک رہا تھا جناب ہوش بلگرامی ہی تنہا ایسے شخص تھے جن کے ذریعہ سے نظام اور نمایندگان حکومت ہند کے درمیان انتہائی رازدارانہ پیغام و مراسلت ہوا کرتی تھی اور جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر حیدرآباد کو تباہی و بربادی سے بچانے کی انتہائی کوشش کی۔

پھر اگر آپ اس عجیب و غریب داستان کے تمام تفصیلی حالات جاننا چاہتے ہیں تو "مشاہدات" ملاحظہ کیجئے جو علاوہ تاریخی اہمیت کے ادب و انشا کی حیثیت سے بھی خاص امتیاز کی مالک ہے۔

یہ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر متعدد تصاویر کے ساتھ مجلد شایع ہوئی ہے اور مع محصول ڈاک کے بارہ روپیہ میں دفتر نگار لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

تاریخ زبان اُردو

تصنیف ہے ڈاکٹر مسعود حسین خاں استاد شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی کی جس کا دوسرا اڈیشن کافی اضافہ کے بعد آزاد کتاب گھر دہلی نے شایع کیا ہے۔

اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۸ء میں شایع ہوا تھا اور اہل فکر و ذوق نے اس کو بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا، اب دوسرا اڈیشن چونکہ مزید اضافوں کے ساتھ شایع ہوا ہے اس لئے اسے "پسندیدہ تر" ہونا ہی چاہئے۔

یہ کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں آریائی زبان کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار سے بحث کی گئی ہے، دوسرے باب میں ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانوں اور ان کی تقسیم و انشعاب کا ذکر ہے، تیسرے باب میں ہندوستانی کے منازل ارتقا اور اُردو کے نشو و نما کی تاریخ پیش کی گئی ہے اور چوتھے باب میں تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے، برج بھاشا، دکنی، پنجابی کا اور اسی سلسلہ میں پروفیسر شیرانی کے لسانی نظریہ پر بھی فاضلانہ نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔

اس وقت تک زبان اُردو کی تاریخ پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں، بعض مختصر، بعض بسیط اور چند بسیط تر، لیکن یہ کتاب جس زاویۂ نظر سے لکھی گئی ہے وہ زیادہ وسیع ہے اور ۱۵۰۰ قبل مسیح سے لیکر عہد اورنگ زیب (۱۷۰۷ء) تک تقریباً دو ہزار سال کی لسانی تحلیل

وتحویل کی تاریخ پیش کرتی ہے۔

سب سے پہلے آزاد نے آبِ حیات میں اس نوع کی تحقیق کی ابتدا کی تھی اور ضرورت تھی کہ پچھلی نصف صدی میں جو نئی معلومات اس باب میں حاصل ہوئی ہیں ان کو سامنے رکھ کر آزاد کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر کوئی عمارت قایم کی جاتی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اسی خدمت کو انجام دیا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ۔

یوں تو یہ کتاب مختصر ہے اور صرف ۲۶۰ صفحات کو محیط ہے، لیکن بہ لحاظ تحقیق استنتاج بڑا وزن رکھتی ہے اور ہر اس شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتا ہے۔ قیمت چار روپیہ۔

افکارِ غالب تصنیف ہے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی جسے مکتبۂ معین الادب اُردو بازار لاہور نے نہایت اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ تقطیع ۱۸×۲۲/۸، ضخامت ۳۵۳ صفحات۔ قیمت ہے

غالب کی زندگی، شاعری، اور اس کے فلسفہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، مضامین کے ذریعہ سے بھی اور مستقل تصانیف کی صورت میں بھی، لیکن اب بھی ہر سال کوئی نہ کوئی قابلِ قدر لٹریچر اس کے متعلق شایع ہو جاتا ہے، چنانچہ حال ہی میں افکارِ غالب کے نام سے ایک کتاب شایع ہوئی ہے، جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے یقیناً ایک نئی تلاش کہی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ملک کے مشہور نقادوں میں سے ہیں اور دنیائے تصنیف و تالیف میں خاص شہرت رکھتے ہیں ان کا شاعرانہ ذوق، ان کا فلسفیانہ مطالعہ اور ان کی قوتِ نقد سب مسلمات میں سے ہیں اور اس کتاب میں ان تینوں باتوں کا اجتماع نظر آتا ہے۔

ان کی قوتِ نقد کا علم ہمیں کتاب کے مقدمہ سے ہو سکتا ہے جس میں انھوں نے نہایت بالغ نظری سے غالب کی شاعری کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اس کے بیان حکمت کو خصوصیت کے ساتھ بہت سراہا ہے۔ یہ مقدمہ ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے اور بجائے خود ایک تصنیفی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے کئی سو صفحات میں غالب کے اُردو فارسی کے حکیمانہ اشعار کا انتخاب کر کے ان کی شرح کی ہے اور پھر صرف فارسی کے حکیمانہ اشعار لیکر ان کی وضاحت فرمائی ہے۔ اس کے بعد "طوفانِ آرزو" کا عنوان علٰحدہ قایم کر کے اس کے مخصوص نظریۂ حکمت کو سامنے رکھ کر حکیمانہ انداز میں صراحت کی ہے۔ اخیر میں اس کے فارسی اُردو کے متفرق اشعار لے کر ان کا مطلب بیان کیا ہے اور اسی کے ساتھ چند رباعیاں بھی درج کی ہیں۔

کلام غالب کی سب سے پہلی شرح ہم کو حالی کی یادگارِ غالب میں نظر آتی ہے، اس کے بعد کافی زمانہ گزر جانے کے بعد اور لوگوں نے بھی اس طرف توجہ کی، لیکن اس کے فارسی کلام کو کسی نے نہیں چھوا اور یہ بڑی کمی تھی جسے اب خلیفہ صاحب نے پورا کیا ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں غالب کے نظریۂ حیات اور اس کے مختلف نظریوں کو اتنی خوبی سے پیش کیا ہے کہ وہ بجائے خود فلسفہ کی تصنیف ہو کر رہ گئی ہے، لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد لوگ کہیں غالب کی شاعری کے ان محاسن کی طرف سے بے پروا نہ ہو جائیں جو فلسفہ و حکمت سے قطع نظر اپنی اک جداگانہ مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور اس طرح یہ کتاب خود غالب کی نگاہ میں "ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب" کی حیثیت اختیار کر لے۔

بنگال میں اُردو مشرقی پاکستان کے موجودہ مسایل میں ایک اہم مسئلہ زبان کا بھی ہے اور مشرقی بنگال اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں کہ اُردو وہاں کی مادری یا قومی زبان قرار دی جائے لیکن اس وقت نہیں اس سے بحث نہیں کہ یہ اختلاف صحیح ہے یا غلط، تاہم یہ ضرور کہیں گے کہ اس مسئلہ میں اُردو کے بعض ادیبوں کو یہ خیال ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اہلِ بنگال کے دل سے یہ بات نکال دیں کہ اُردو ان کے لئے بالکل اجنبی زبان ہے، چنانچہ کتاب زیرِ تبصرہ بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ

اُردو بنگال کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ صدیوں سے وہ یہاں کی ادبی زبان بنی ہوئی ہے

فاضل مصنف نے اس تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے، پہلا دور فورٹ ولیم کالج کا ۱۷۰۰ء سے ۱۸۲۵ء تک کا، دوسرا دور جب وہاں شاعری کا عروج ہوا (۱۸۷۵ء تک)، تیسرا دور ۱۹۱۰ء تک اور چوتھا ۱۹۵۴ء تک اور ان تمام ادوار کے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کرکے اُن شاعری و ادبی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ بنگال کے کتنے اخبار اُردو کے جاری ہوئے اور کتنی انجمنیں قایم ہوئیں۔

یہ کتاب بنگال میں اُردو کے نشو و نما کی جامع تاریخ بھی ہے اور ایک بسیط تذکرہ بھی۔ وہاں کے متعدد ہندو مسلمان شعراء اور انکے منتخب اشعار کا۔ اور اس کے فاضل مصنف جناب وقار راشدی نے جس محنت و کاوش کے ساتھ اسے مرتب کیا ہے وہ یقیناً قابلِ ستایش ہے

ہمیں امید ہے کہ اُردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں گے اور نوجوان مصنف کا حوصلہ بڑھائیں گے تاکہ وہ اپنی تحقیق کا سلسلہ آیندہ بھی جاری رکھ سکیں۔

متعدد شعراء کی تصاویر نے اس کتاب کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس کی ضخامت ۱۹۶ صفحات ہے اور مکتبہ اشاعت اُردو حیدر آباد سندھ سے پانچ روپیہ میں مل سکتی ہے۔

سنگ میل دوسرا مجموعہ ہے جناب یعقوب عثمانی پروفیسر اورنگ آباد کالج کی ۳۲ نظموں اور متعدد غزلوں کا جو ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۳ء تک انھوں نے لکھی ہیں۔ یعقوب عثمانی ہیں تو اس دور کے نئے شاعر، لیکن اتنے نئے نہیں کہ لوگ ان کے نام سے ناآشنا ہوں، اس سے پہلے ان کی غزلوں کا مجموعہ "شعر و نغمہ" کے نام سے شایع ہوکر تمام سنجیدہ ارباب ذوق کی داد حاصل کر چکا ہے، فرق یہ ہے کہ "شعر و نغمہ" میں وہ صرف غزل گوئی کی حیثیت سے سامنے آئے تھے اور سنگ میل میں ان کی "نظم نگاری" کا روشن رخ بھی ہمارے سامنے ہے۔

یعقوب صاحب کی شاعری ایک ایسے لکھے پڑھے شخص کی شاعری ہے جو صد درجہ مہذب و شایستہ بھی ہے اور مصلح و مودب بھی۔ ان کی شاعری کا مقصود الفاظ سے کھیلنا نہیں، بلکہ ان کے ذریعہ سے مقاصدِ حیات کی راہیں متعین کرنا اور شعر گوئی کا ایک سنجیدہ و دلکش معیار قایم کرنا ہے، ان کی غزلیں ہوں یا نظمیں سب میں زندگی جھلکتی ہے۔ اور ان کو پڑھ کر ایک خاص قسم کا سکون محسوس ہوتا ہے۔ اندازِ بیان کی ندرت، مضمون کی بلندی، الفاظ کی خوبصورت نشست، تراکیب کی حلاوت، ان کی شاعری کی وہ مخصوصیات ہیں جو ان کے پہلے مجموعہ میں بھی ہم کو ہر جگہ نظر آتی تھیں، لیکن اس مجموعہ میں یہ رنگ اور زیادہ چوکھا ہوگیا ہے۔

یہ مجموعہ پروفیسر ہادی القادری نظام کالج حیدر آباد اور یوسف عثمانی صاحب محلہ گھاٹی اورنگ آباد سے دو روپیہ میں ملسکتا ہے

تب و تاب مجموعہ ہے مولوی محمد یحییٰ تنہا کی نظموں اور غزلوں کا جسے علمی ادارہ۔ راج گڑھ روڈ لاہور نے شایع کیا ہے

جناب تنہا نئے ادیب و شاعر نہیں ہیں، پختہ کاران شعر و ادب میں ان شمار ہوتا ہے اور جنھوں نے ان کے مشہور تذکرہ "مراۃ الشعر" کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کا مطالعۂ ادب کتنا وسیع ہے۔

ان کا رنگِ سخن یکسر اصلاحی ہے جو نتیجہ ہے حالی کے مطالعہ کا۔ وہ ہر بات کام کی کہنا چاہتے ہیں اور بالکل "کار آگہانہ" انداز سے اس لئے ان کے کلام میں شاعرانہ دلچسپی ہو یا نہ ہو، لیکن مصلحانہ کارفرمائی ضرور ہے جس کی آج کل ہمیں سخت ضرورت ہے۔

جناب تنہا میرٹھ کے رہنے والے ہیں لیکن تقسیم ہند کے بعد وہ لاہور چلے گئے اور اب ایک سال سے کراچی میں مقیم ہیں ان کی زندگی کا مشغلہ صرف لکھنا پڑھنا ہے اور علم و ادب کی جو خدمت وہ یہاں ہندوستان میں انجام دیتے تھے، اب پاکستان میں انجام دے رہے ہیں۔

اس مجموعہ کی قیمت دو روپیہ آٹھ آنے ہے

ترانۂ دل

دوسرا مجموعہ ہے حضرت دلؔ شاہجہانپوری کی غزلوں کا۔ اس سے پہلے ۳۲ء میں نغمۂ دلؔ کے نام سے ایک مجموعہ شایع ہو چکا تھا، لیکن ضرورت تھی کہ اس کے بعد جو غزلیں انھوں نے لکھی ہیں وہ بھی اس میں شامل کر دی جائیں اور اس طرح یہ مجموعہ کلیات کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت دلؔ کا شمار اس وقت کے مشہور و مستند اساتذہ میں ہے اور اس حیثیت سے کہ جناب امیرؔ مینائی کی رحلت کے بعد متفقہ طور پر انھیں کو مرحوم کا جانشین قرار دیا گیا وہ صف اساتذہ میں بھی ایک خاص مرتبہ کے مالک ہیں۔ حضرت دلؔ اس عہد کی یادگار ہیں جب اردو تغزل میں داغؔ اور امیرؔ و جلالؔ کے رنگ میں ہر محفل شعر و سخن رچی ہوئی تھی۔

داغؔ کے بعد ان کے تلامذہ میں بیخودؔ دہلوی اور نوحؔ ناروی نے اپنے استاد ہی کے رنگ میں نام پایا اور سیمابؔ نے بھی خاص شہرت حاصل کی لیکن پیرو داغؔ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس رنگ کو چھوڑ دینے کی بنا پر، امیرؔ کے بعد ان کے تلامذہ میں ریاضؔ، جلیلؔ اور دلؔ شاہجہانپوری نے شہرت پائی اور ان میں سے ہر ایک نے بجائے خود استادانہ حیثیت حاصل کر لی۔ ریاضؔ کا رنگ بہت کچھ اپنے استاد سے ملتا تھا، لیکن جلیلؔ و دلؔ کا انداز بدلا اور ماضی کی روایتی شاعری میں انھوں نے مستقبل کے امکانات کو بھی جگہ دی۔ جلیلؔ کا ماحول ایسا تھا کہ وہ اپنے فطری میلان کی پوری رعایت نہ کر سکے، لیکن دلؔ شاہجہاں پوری خود اپنے جذبات کے مالک تھے اور کسی ناموافق ماحول کے زیر اثر نہ تھے، اس لئے انھوں نے اپنے استاد کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر ایک نئی عمارت قایم کی جو زیادہ دلکش اور زیادہ خوبصورت تھی۔

حضرت دلؔ کے تغزل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ نہیں کہ وہ اسقام و عیوب سے پاک ہے، کیونکہ یہ اس دور کے شاعر میں جب شعر اک مستقل فن سمجھا جاتا تھا اور فن کی حیثیت سے اس پر عبور حاصل کیا جاتا تھا، بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں سوقیت و ابتذال کا پتہ نہیں اور ان جذبات کے اظہار میں بھی وہ متانت ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جن کے اظہار میں ان کے استاد بھی کھل کھیلتے تھے۔ صبر و ضبط، احتیاط فطرت، دلؔ کی فطرت ہے اور ان کی یہ فطرت ہر ہر شعر میں نمایاں ہے۔

ان کا کلام لفظی صناعت یا ایہام سے بالکل پاک ہے اور اپنے انداز بیان کے لحاظ سے گوناگوں دلکشی اپنے اندر رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو جون ۵۵ء کا نگار جس میں میں نے ان کا مختصر سا انتخاب پیش کیا ہے۔ میرا ایک مبسوط مقدمہ بھی کلیات میں شامل ہے جس میں ان کی شاعری کی تمام خصوصیات پر میں نے مفصل گفتگو کی ہے۔

یہ مجموعہ ہے میں شفیق حسن خاں صاحب محلہ ہاتھی خاں، شاہجہاں پور سے مل سکتا ہے۔

جام فیروزاں

دیوان ہے سید بشیر حسین بشیرؔ کا، جسے نہایت اہتمام کے ساتھ خود انھوں نے شایع کیا ہے۔ دیوان کھولتے ہی ہمیں سب سے پہلے مولانا آزادؔ سبحانی کا مقدمہ نظر آتا ہے، اس کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کا پیش لفظ اور پھر حضرت اثرؔ لکھنوی کا تبصرہ۔ جناب بشیرؔ، اکبرؔ الہ آبادی کے نواسے ہیں، لیکن ان کا رنگ شاعری اپنے نانا سے بالکل مختلف ہے۔ اعتبار و بصیرت ہمیں اکبرؔ کے یہاں بھی ملتی ہیں، لیکن رنگ، ظرافت میں، جناب بشیرؔ کے یہاں یہ چیز بالکل برانگیختہ نقاب نظر آتی ہے۔ بشیر صاحب بڑے خوش اوقات، بڑے مرتاض، نہایت بلند اخلاق کے انسان ہیں اور انھیں خصوصیات کے ساتھ اک انتہائی دردمند دل بھی رکھتے ہیں، جس نے ان کی شاعری میں بلندی، پاکیزگی اور نفاست پیدا کر دی ہے۔ حقایق معرفت کا بیان ان کا خاص ذوق ہے، لیکن خشک اصطلاحی انداز کا نہیں، بلکہ صحیح عاشقانہ رنگ کا جس سے براہ راست ہمارا وجدان متاثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری خصوصیات ان کے کلام کی یہ ہے کہ فنی حیثیت سے بھی وہ اسقام و عیوب سے پاک ہے۔

اخیر میں چند نظمیں بھی درج ہیں اور نظم کی تمام خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہیں۔ یہ مجموعہ ۸؎ میں انتظامی پریس کانپور سے مل سکتا ہے۔

ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت

اردو ترجمہ ہے جناب آصف فیضی کے ایک انگریزی مقالہ کا جو مڈل ایسٹ جرنل میں شایع ہوا تھا۔

مقالہ کا موضوع نام سے ظاہر ہے اور جس ضرورت کے پیش نظر موصوف نے یہ مقالہ لکھا ہے اس کی اہمیت سے کسی صاحب نظر کو انکار نہیں ہو سکتا۔ موصوف نے مذہب اسلام کے اصولی عقاید سے بحث نہیں کی ہے بلکہ صرف ان مسایل کو لیا ہے جو نصاب تعلیم اور قانون یا شریعت سے متعلق ہیں اور اس سے غالباً ہمارے بعض موجودہ علماء کو بھی اتفاق ہوگا کہ اقتضاء زمانہ کے لحاظ سے یقیناً ان میں تغیر و تبدل کی شدید ضرورت ہے۔ مقالہ میں اس تحریک کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اکابر علم کو غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور بعض ان اکابر علم و فضل کا بھی ذکر کیا ہے جو اس نوع کے تغیر و تبدل کی ضرورت کو اس سے قبل محسوس کر چکے تھے۔ اس میں شک نہیں یہ مقالہ باوجود اختصار کے بڑی جامعیت رکھتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اگر سب نہیں تو چند علماء دین ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے۔ ترجمہ چودھری رحم علی ہاشمی نے کیا ہے۔ قیمت ۱ر۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔

اغوا ناول ہے جناب حکیم کوثر چاندپوری کا جسے مکتبۂ جمالستان، مٹیا محل، دہلی نے شایع کیا ہے۔ کوثر صاحب ملک کے مشہور ادیب و انشا پرداز ہیں اور اس وقت تک وہ خدا جانے کتنے افسانے و ناول لکھ چکے ہیں۔ جب تک افسانوں کا دور رہا انھوں نے افسانوں کے ذریعہ سے ادب کی گرانقدر خدمات انجام دیں اور اب کہ ناول کی طرف ملک کو توجہ ہوئی ہے، وہ ناول لکھ کر اس فریضہ کو ادا کر رہے ہیں۔

اس ناول میں انھوں نے معاشی و جنسی گتھیوں کو نہایت خوبی سے سلجھایا ہے اور ناول نویسی کی تمام خصوصیات کو جو تجزیۂ کردار، ترتیب واقعات اور جذبات کے اُتار چڑھاؤ سے تعلق رکھتے ہیں، کسی جگہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ناول کی بڑی خوبی اس کا تدریجی پھیلاؤ ہے جو اخیر میں ایک نقطۂ عروج پر پہونچ کر کسی خاص منزل کی طرف ہماری رہبری کرتا ہے اور یہ خصوصیت اس ناول میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے بعض مقامات پر البتہ انھوں نے بعض غیر ضروری وضاحتوں سے کام لیا ہے، حالانکہ وہ انھیں باتوں کو زیادہ سنجیدگی کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔ امید ہے کہ کوثر صاحب کی ان ادبی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات۔ قیمت تین روپیہ

توڑو زنجیریں ناول ہے حضرت کوثر چاندپوری کا جسے جھلک بک ڈپو علیگڈھ نے شایع کیا ہے۔ اس کا پس منظر وہ زمانہ ہے جب آزادی ہندوستان سے قبل تمام ملک اور خصوصیت کے ساتھ ریاستوں میں آزادی کے خلاف زیادہ سختیاں شروع ہو گئی تھیں اور ان زنجیروں کو توڑنے کے لئے عام ہیجان پیدا ہو چلا تھا۔

ایسے ماحول اور ایسے زمانہ میں جو جذباتی کشمکش پائی جاتی ہے، اس کو سامنے رکھ کر کوئی ایسا ناول لکھنا جو اعتدال و توازن کو قایم رکھ سکے آسان بات نہ تھی۔ لیکن چونکہ کوثر صاحب فطرتاً بہت سنجیدہ اور مفکر قسم کے انسان ہیں، اس لئے انھوں نے منزل کو بڑی کامیابی سے طے کیا اور ایسا پلاٹ تجویز کیا جس میں افادیت و دلچسپی دونوں اپنی اپنی جگہ قایم رہیں۔

زبان و مکالمہ کی خوبی اور جزئیات نگاری کے علاوہ اس میں ہم کو وہ جوش و ولولہ بھی نظر آتا ہے جو ماحول کا صحیح اقتضا تھا۔ کہیں کہیں اس میں خطابت کا رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے جو اپنی جگہ بڑا وزن رکھتا ہے۔ کوثر صاحب بڑے مشاق ناول نگار ہیں اور بڑے سلیقہ کے ساتھ وہ اپنے کرداروں کو آگے بڑھاتے ہیں۔

واقعات اور قصہ کے تار و پود کے لحاظ سے بھی یہ ناول کافی دلچسپ ہے۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات۔ قیمت ۱ر۔

گنجایش کی کمی

کے وجہ سے بعض کتابوں کا ریویو اس مہینہ میں شایع ہونے سے رہ گیا۔ آیندہ مہینہ میں انھیں درج کیا جائے گا۔ منیجر

-: Hindustani Library :-
R-28 Garden Reach Rd. Calcutta
No.....

نگار کے خاص نمبر

سنہ ۱۹۴۸ء
جنوری ، فروری

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے۔ جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی

قیمت دو روپے
علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد لوگ نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اسی انداز سے کیا گیا ہے کہ آپکو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کیلئے اسکا مطالعہ ضروری ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سنہ ۱۹۴۹ء
جنوری ، فروری

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیے

قیمت دو روپے
علاوہ محصول

سنہ ۱۹۲۶ء
فروری ، مارچ

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

سنہ ۱۹۵۱ء
جنوری، فروری

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں ارس ہنڈی کی شہرہ عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے جس میں اس نے ایران مصر، عراق فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسکے ساتھ ہی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت عا

علاوہ محصول

سنہ ۱۹۵۳ء
جنوری، فروری
(داغ نمبر)

جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رام پور، قیام حیدرآباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور انکے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سنہ ۱۹۴۳ء
جنوری

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کو شاعری کیا تھی۔ قیمت ۸ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۱۹۵۴ء
(قرآں روایات اسلام نمبر)

یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لیکر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر انکے اسباب عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل تاریخی کتاب ہے۔ جو ہر گھر پڑھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

سنہ ۱۹۲۸ء
سالنامہ

(موسن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ موسن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے

سالنامہ سنہ ۱۹۵۵ء
(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) مع تتمہ

جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

REGD. N. A 966

رجسٹرڈ نمبر اے ۹۶۶

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور ادبیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۸۲ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے

قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔

(۱) چند گمشدہ فلاسفہ قدیم کی رایوں کے ساتھ۔

(۲) مادر کا مذہب نما بیت مفید اور دلچسپ کتابچہ

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے بادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لیے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس کی تمام نشہ بخش کیفیات اس نے ایک جگہ جمع کر دی ہیں۔ پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس کا جواب نہیں مل سکتا

دوسری جگہ ایسی نظر نہیں آ سکتی

تازہ ایڈیشن نہایت خوبصورت خط

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے اُن کی اپنی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے، اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول ڈاک

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت دو روپے

علاوہ محصول ڈاک

مذاکراتِ نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول ڈاک

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ نہرست مضامین یہ ہے۔ ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر ہماری تبصرہ اردو غزل گوئی کی عہد بہ عہد ترقی، نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون ادبیہ و حقیقت نگاری

قیمت چار روپے علاوہ محصول

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری

اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و ننگ نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکہ آلارا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول

(باقی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)